بسم اللہ الرحمن الرحیم

ولقد آتیناک سبعا من المثانی والقرآن العظیم

دروس سورۃ الفاتحہ

تعوذ، تسمیہ، فاتحہ کی تفسیر
اور فکر و تدبر کے نئے گوشے

افادات

حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمہ اللہ تعالیٰ

المتوفی ۱۹۸۳ء

مولانا علی اصغر عباسی

مکتبہ عباسیہ

جامع مسجد نیلا گنبد، لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ولقد آتیناک سبعا من المثانی والقرآن العظیم

دروس سورۃ الفاتحہ

بعنوان

تعوّذ، تسمیہ، فاتحہ کی تفسیر اور فکر و تدبّر کے نئے گوشے

افادات

حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمہ اللہ تعالیٰ

المتوفی ۱۹۸۳ء

TARIQ MEHMOOD
20-6-03

مرتّبہ

مولانا علی اصغر عبّاسی

مکتبہ عبّاسیہ

جامع مسجد نیلا گنبد، لاہور

نام کتاب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ درُوسِ سُورۃ الفاتحہ

افادات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حضرت مولانا علامہ شمس الحق افغانیؒ

مرتب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علی اصغر العباسی

سائز کتاب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۰×۲۶ / ۸

سن اشاعت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مئی ۱۹۹۲ء ، ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ

تعداد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پہلا ایڈیشن گیارہ سو (۱۱۰۰)

ضخامت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تین صد صفحات (۳۰۰)

کتابت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محمد حسین خاور

ناشر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ المکتبۃ العباسیہ
جامع مسجد نیلا گنبد لاہور

✱

قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَاءٌ

کہہ دیجیے کہ یہ قرآن ایمان والوں کے لیے عظیم الشان راہ نما اور نسخۂ شفا ہے

اَلَا اِنَّ هٰذَا شَمْسُ عِلْمٍ تَلَأْلَأَتْ   عَلٰى اُفُقِ الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ جَانِبٖ

خبردار یہ کتاب علم و معرفت کا ایک آفتاب ہے،   جو قرآن کے اُفق پر ہر طرف چمک گیا ہے!

كِتَابٌ وَّنِبْرَاسٌ وَّنُوْرٌ وَّحِكْمَةٌ   وَّفِيْ كُلِّ سَطْرٍ مِّنْهُ عِلْمُ الْعَجَائِبِ

یہ ایک کتاب ہے اور ایک چراغ ہے۔ نور اور حکمت ہے   اس کی ہر سطر میں عجائب قرآن کا علم موجود ہے!

فَاِنْ اَنْتَ تَشْتَهِيْ اَنْ تَفُوْزَ فَفُزْ بِهٖ   مَعَارِفُ شَمْسِ الْحَقِّ فَوْقَ السَّحَائِبِ

اگر تم کو علوم قرآنیہ پر فائز ہونے کی خواہش ہو تو اس کتاب سے کامیاب ہو سکتے ہو کیونکہ حضرت مولانا شمس الحق صاحب دامت برکاتہم کے معارف بادلوں کی بلندی سے کہیں اُوپر ہیں۔

لَهٗ عِلْمُ اَسْلَافٍ وَّتَدْبِيْرُ خَالِفٍ   وَّشَرْحُ كَلَامِ اللهِ جُلُّ الْمَطَالِبِ

حضرت موصوف کا علم تو اسلاف کا ہے اور تدبیر متاخرین کی ہے   اور کلام اللہ کے زبردست جلیل المطالب شارح ہیں

بِهٖ تَدْفَعُ الزَّيْغَ الَّذِيْ شَاعَ عِنْدَنَا   لِاَهْلِ الْهَوٰى مِنْ كُلِّ اَهْلِ الْاَكَاذِبِ

اس کتاب سے تم وہ کجی درست کر سکتے ہو جو فی زمانہ رواج پا چکی ہے اور جس کو اہل ہوا اور کاذبین نے رواج دیا ہے!

احقر الخدّام

لطائف الرحمٰن الافغانی کان اللہ لہٗ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

مرتّب دُروسِ سورۃ الفاتحہ اس حقیر محنت کو اپنے استاذ گرامی
حضرت مولانا علامہ شمس الحق افغانی رحمہ اللہ المتوفیٰ ۱۴۰۳ھ ، ۱۹۸۳ء
کے نامور استاذ

امام العصر بیہقی زماں ، استاذ الاساتذہ ، شیخ الاسلام
حضرت مولانا علامہ سیّد محمّد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ المتوفیٰ ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۴ء
کے نام نامی اسم گرامی سے منسوب کرتا ہے
جن کے متعلق

شاعرِ مشرق محترم علامہ محمّد اقبال مرحوم نے فرمایا تھا :
"اسلام کی اُدھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے"

علامہ افغانی رحمہ اللہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے شاگرد رشید ہی نہ تھے بلکہ
ان کے بعد ان کے قائم کردہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے
ان کے مسند نشین بھی رہے

اس منصب پر حضرت افغانی رحمہ اللہ کو ان کے دوسرے نامور استاذ ، زبانِ قاسم رحمہ اللہ
غزالی دوراں ، شیخ الاسلام پاکستان حضرت مولانا علامہ شبّیر احمد عثمانی رحمہ اللہ المتوفیٰ ۱۳۶۹ھ / ۱۹۴۹ء
سابق صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند نے فائز فرمایا تھا ۔

أُولٰئِكَ اٰبَائی فَجِئْنی بِمِثْلِهِم

اذا جمعتنا يا جرير المجامعُ

اَللّٰهُمَّ اغفر لهم، وارحم عليهم

واجزهم عنا، وعن جميع الامة خير الجزاء

وَصَلِّ اللّٰهُمَّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ على عِزِّ الوجود

سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰله وصحبه اجمعين،

ومن تَبِعَهُمْ باحسان الى يوم الدين.

وَبرحمتك يا ارحم الرّاحمين.

الاحقر علی اصغر العباسی

جامع مسجد نیلا گنبد

لاهور

۱۷ر شوال المکرم سنہ ۱۴۱۲ھ

۲۱ اپریل سنہ ۱۹۹۲ء

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	انتساب	۴
۲	دُعاء : حضرت مولانا محمد عبید اللہ و مولانا عبد الرحمٰن اشرفی	۲۲
۳	پیش لفظ : حضرت مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی	۲۴
۴	تقریظ : حضرت سید انور حسین نفیس رقم	۲۹
۵	" حضرت مولانا سید محمد عبد القادر آزاد	۳۰
۶	" حضرت مولانا محمد اجمل خان	۳۳
۷	" ابن الطیب مولانا قاری محمد سالم	۳۵
۸	" حضرت مولانا ضیاء القاسمی	۳۷
۹	" مولانا حافظ فضل الرحیم	۳۸
۱۰	" مولانا محمد عارف	۴۱
۱۱	تبصرہ : اسرار غنی اسد (نوائے وقت لاہور)	۴۳
۱۲	سوانحی خاکہ شیخ الاسلام استاذ العلما حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانی رح	۴۷
۱۳	مقدمہ : از مرتب افادات	۶۳
۱۴	کچھ اپنے بارے میں	۸۰
۱۵	تشکر و امتنان	۹۹

نمبر شمار	عنوانات	بر صفحہ
۱۶	تفسیر تعوّذ یعنی اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ	۱۰۱
۱۷	تعوّذ کے تحت مباحث	۱۰۱
۱۸	استعاذہ کے مفردات کی تشریح	۱۰۲
۱۹	اَلرَّجِیْم	۱۰۳
۲۰	تعوّذ کی جامعیت	۱۰۳
۲۱	مستعاذ لہٗ کو نظر انداز کرنے کا نکتہ	۱۰۴
۲۲	ایک ضروری تنبیہ	۱۰۵
۲۳	شیطان کے اجمالی کارنامے	״
۲۴	اعوذ باللہ میں واحد کا صیغہ کیوں استعمال ہوا ہے	۱۰۶
۲۵	اعوذ باللہ میں با کی حقیقت	״
۲۶	سِرِّ تقدیم	۱۰۷
۲۷	مضرّت و منفعت کی حقیقت	״
۲۸	دفع مضرّت اور جلب منفعت کا تقابل	۱۰۸
۲۹	مقدمہ نمبر ۲ : مضرّت کثیرہ اور منفعت قلیلہ کا تقابل	״
۳۰	شیطانی مضرّت کی اہمیت	۱۰۹
۳۱	مقدمہ نمبر ۴ : قلیل الاسباب چیز اہم ہوتی ہے	״
۳۲	تعوّذ کی تقدیم کا ایک صوفیانہ نکتہ	۱۱۰
۳۳	سِرِّ تخصیص	۱۱۱

نمبر شمار	عنوانات	بر صفحہ
۳۴	مضرات کے درجات	۱۱۱
۳۵	حیات طیبہ کی حقیقت	۱۱۲
۳۶	محکمۂ اغواء و اضلال کا انچارج ابلیس	۱۱۳
۳۷	شیطانی عداوت پر امام غزالی کا ایک شاندار جملہ	۱۱۴
۳۸	عدوِّ غیر محسوس	〃
۳۹	سرِّ تدبیر	۱۱۵
۴۰	شیطانی تشکوک و شبہات کے طرق	〃
۴۱	اقسام شبہات	۱۱۶
۴۲	شبہ فی الانتساب کی اقسام	۱۱۷
۴۳	شُبہ فی الثبوت کا محرک	۱۱۸
۴۴	شبہ فی الدّلالت	۱۲۰
۴۵	معنوی تبدیلی کی ایک مثال	〃
۴۶	شبہ فی المنتسب	۱۲۱
۴۷	قوانین کی معقولیت ماہرین ہی جانتے ہیں	۱۲۲
۴۸	جہاد روحانی آپریشن ہے	۱۲۴
۴۹	قتل مرتد جبر نہیں	〃
۵۰	شُبہ فی المنتسب کا حاصل چار امور ہیں	۱۲۵
۵۱	خواہشات کے شیطانی حملے کا دفاع	۱۲۸

نمبر شمار ــــــــ عنوانات ــــــــ بر صفحہ

۵۲ ــ ایک لطیفہ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ۱۲۸
۵۳ ــ نقد اُدھار سے بہتر ہونے کی شیطانی منطق ــ ــ ــ ــ ۱۲۹
۵۴ ــ تغریر بصفات اللہ تعالےٰ ــ ــ ــ ــ ۱۳۰
۵۵ ــ اللہ تعالےٰ کی صفات جلال و جمال کا تناسب ــ ــ ــ ″
۵۶ ــ تغریر تسکین الشہوات ــ ــ ــ ــ ۱۳۱
۵۷ ــ تغریر تسکین الغضب ــ ــ ــ ــ ۱۳۲
۵۸ ــ سِرّ تاثیر ــ ــ ــ ــ ″
۵۹ ــ تعوذ مؤثر بالخاصہ ہے ــ ــ ــ ــ ۱۳۳
۶۰ ــ معقول توجیہہ ــ ــ ــ ــ ″
۶۱ ــ ایک محسوس مثال ــ ــ ــ ــ ۱۳۴
۶۲ ــ سِرّ وجود : یعنی کیا شیطان کا وجود ہے ؟ اسکے عقلی و نقلی دلائل ... ۱۳۶
۶۳ ــ بائیبل میں بھی شیطان کا ذکر ہے ــ ــ ــ ــ ″
۶۴ ــ شیطان کے وجود پر ایک لطیفہ ــ ــ ــ ــ ۱۳۷
۶۵ ــ اسلام میں شیطان کا فوٹو نہیں دکھایا گیا ــ ــ ــ ″
۶۶ ــ وجود شیطان پر ایک نفسیاتی دلیل ــ ــ ــ ــ ″
۶۷ ــ گناہ کے تصور میں تین عقلی احتمال ــ ــ ــ ــ ۱۳۸
۶۸ ــ سِرّ تخلیق ــ ــ ــ ــ ۱۳۹
۶۹ ــ دلیل اوّل تکمیل انسانیت ــ ــ ــ ــ ۱۴۰

نمبر شمار	عنوانات	بر صفحہ
٧٠	حبِّ الٰہی کی تکمیل کی ایک محسوس مثال	١٤٠
٧١	خیر و شر کے لحاظ سے مخلوق کی تقسیم	١٤٢
٧٢	دلیل دوم۔ دینی ڈیفنس	١٤٣
٧٣	گناہوں کے کمالات	〃
٧٤	شیطان کی تخلیق کی تیسری حکمت تحمّل مشکلات کا خوگر بنانا ہے	١٤٤
٧٥	چوتھی حکمت، مضبوط دشمن کا وجود اپنی قوت میں اضافہ کا سبب ہوتا ہے	١٤٥
٧٦	حکومتِ نفسی کا حکومت آفاقی پر قیاس	〃
٧٧	حضرت نانوتوی رح کا ارشاد	١٤٦
٧٨	حضرت سید علی ہجویری رح کا ارشاد	〃
٧٩	تعوذ کا اخلاقی سبق	١٤٧
٨٠	تعوذ کا سیاسی سبق	〃
٨١	تسمیہ کی تفسیر	١٤٩
٨٢	عظمتِ تسمیہ	〃
٨٣	حذف عامل کا نکتہ	〃
٨٤	الرحمٰن الرحیم	١٥٠
٨٥	رَحِم بکسر العین رَحُم بضم العین کے معنی میں فرق	〃
	سید محمود آلوسی رح کی رائے رحمٰن و رحیم کے بارے میں	١٥١
٨٦	تسمیہ کے مباحث اور اسمائے باری تعالیٰ	〃

نمبر شمار ---------- عنوانات ---------- بر صفحہ

۸۷ ـ صفات باری تعالےٰ کے متعلق لاعین ولا غیر کی تشریح ---------- ۱۵۲

۸۸ ـ اسمائے الٰہی ننانوے کی تشریح ---------- ۱۵۳

۸۹ ـ قرآنی آیت کلماتُ رَبّی کا مطلب ---------- ״

۹۰ ـ اسمائے خداوندی حکومتی محکموں کے قائم مقام ہیں ---------- ۱۵۴

۹۱ ـ اسمائے الٰہیہ سے توسّل ---------- ״

۹۲ ـ اعمالِ صالحہ کے ذریعہ توسّل ---------- ۱۵۶

۹۳ ـ مُردوں کو وسیلہ بنانا ---------- ۱۵۷

۹۴ ـ ابتداء اسلام میں زیارت قبور سے منع کی حکمت اور

۹۵ ـ زیارتِ قبور کے فوائد ---------- ۱۵۸

۹۶ ـ اللہ تعالےٰ کے اسماء بھی مؤثر ہیں ---------- ״

۹۷ ـ اسماء الٰہی سے جسمانی وروحانی دونوں فائدے ہوتے ہیں ---------- ۱۵۹

۹۸ ـ تسمیہ میں تین اسماء خداوندی کے انتخاب کی حکمت ---------- ۱۶۰

۹۹ ـ تسمیہ میں اسم جلالی ایک اور جمالی دو لانے کی حکمت ---------- ۱۶۱

۱۰۰ ـ تکوینیات میں رحمت کا غلبہ ---------- ۱۶۲

۱۰۱ ـ تشریعیات میں رحمت کا غلبہ ---------- ״

۱۰۲ ـ بسم اللہ قرآنی عُلوم کی جامع ہے ---------- ۱۶۳

۱۰۳ ـ اندراج الکثیر فی القلیل کا جواب ---------- ۱۶۴

۱۰۴ ـ محل حافظہ کیا ہے؟ ---------- ۱۶۵

نمبر شمار ـــــــ **عنوانات** ـــــــ نمبر صفحہ

۱۰۵ ـ اندراج الکثیر فی القلیل کا تحقیقی جواب ۔۔۔۔۔۔ ۱۶۵

۱۰۶ ـ کثیر کا قلیل میں اندراج پر امام غزالیؒ کی مثال ۔۔۔۔۔۔ ۱۶۶

۱۰۷ ـ بسم اللہ میں علوم قرآنی کا خلاصہ اور اسکی تشریح ۔۔۔۔۔۔ ۱۶۷

۱۰۸ ـ تمام علوم کا با میں اندراج اور اسکی تشریح ۔۔۔۔۔۔ ۱۶۸

۱۰۹ ـ علوم قرآنی کا با کے نقطے میں اندراج اور اسکی تشریح ۔۔۔۔۔۔ ۱۶۹

۱۱۰ ـ طریقہ سنت کی عظمت اور با کے نقطے میں ایک نکتہ ۔۔۔۔۔۔ ۱۷۰

۱۱۱ ـ تعوذ و تسمیہ کے نتائج سیاسیہ ۔۔۔۔۔۔ ۱۷۱

۱۱۲ ـ جذبہ بغض و عداوت کے تین ہدف ۔۔۔۔۔۔ 〃

۱۱۳ ـ جذبہ عداوت کے مواقع کی ایک مثال ۔۔۔۔۔۔ 〃

۱۱۴ ـ تسمیہ کا سیاسی سبق ۔۔۔۔۔۔ ۱۷۳

۱۱۵ ـ تعوذ و تسمیہ کا دوسرا سیاسی فائدہ ۔۔۔۔۔۔ 〃

۱۱۶ ـ استعاذہ اور تسمیہ کا تیسرا سیاسی سبق ۔۔۔۔۔۔ 〃

۱۱۷ ـ استعاذہ اور تسمیہ کا اخلاقی سبق ۔۔۔۔۔۔ ۱۷۴

۱۱۸ ـ اسباب کی قسمیں اور ان کی حیثیت ۔۔۔۔۔۔ ۱۷۵

۱۱۹ ـ اسلام میں توکل کی حقیقت ۔۔۔۔۔۔ ۱۷۶

۱۲۰ ـ صحابہ کرام اور توکل ۔۔۔۔۔۔ ۱۷۸

۱۲۱ ـ سورۃ فاتحہ کی لغوی تفسیر ۔۔۔۔۔۔ ۱۸۰

۱۲۲ ـ حل مفردات ۔۔۔۔۔۔ 〃

نمبر شمار	عنوانات	بر صفحہ
۱۲۳	تربیت کی تعریف ، العالمین	۱۸۱
۱۲۴	الرحمٰن الرحیم کی لغوی تحقیق	۱۸۲
۱۲۵	رحمت کی تعریف اور مفسرین کرام	//
۱۲۶	رحمت کا وہ معنیٰ جس پر اعتراض نہ ہو	۱۸۳
۱۲۷	مالکِ یوم الدین	//
۱۲۸	"نعبد" شریعت کی نظر میں عبادات کی روح اور صورت دونوں	۱۸۴
۱۲۹	ہی مطلوب ہے ۔	۱۸۵
۱۳۰	ہدایت کے معنی ، "نستعین"	۱۸۶
۱۳۱	"صراط" - "المستقیم"	۱۸۷
۱۳۲	دین اسلام ذاتاً و اضافتاً سیدھی سڑک ہے	۱۸۸
۱۳۳	النعمت ، المغضوب ، ولا الضالین	//
۱۳۴	ضلالت کے مختلف معانی	//
۱۳۵	سورۃ فاتحہ کی تفسیر ادبی	۱۹۰
۱۳۶	معارف و نکات کے ضمن میں ایک ضروری وضاحت	//
۱۳۷	سورۃ الفاتحہ ایک درخواست ہے	//
۱۳۸	سورۃ فاتحہ میں درخواست کے مضامین	۱۹۲
۱۳۹	سورہ فاتحہ میں القاب خداوندی ، کاتب و مکتوب الیہ کے تعلقات	//
۱۴۰	درخواست کا مقصد	۱۹۳

نمبر شمار	عنوانات	نمبر صفحہ
۱۴۱	صراط مستقیم کا مطلب اور جامعیت	۱۹۴
۱۴۲	صراط الذین کو بطور بدل لانے کا فائدہ	//
۱۴۳	الفاظ صدیقین، شہدار، صالحین کی وضاحت	۱۹۵
۱۴۴	صحابہ سب صدیق تھے	۱۹۶
۱۴۵	سلف صالحین مدارج حق ہیں؟	//
۱۴۶	صراط المستقیم کی تعبیر میں ایک خاص نکتہ	۱۹۸
۱۴۷	مذاہب اربعہ کی ایک محسوس مثال	۱۹۹
۱۴۸	**سورۃ فاتحہ کی اخلاقی تفسیر**	//
۱۴۹	لفظ اخلاق کی تشریح	//
۱۵۰	اخلاق کی حقیقت حضرت امام غزالیؒ کے الفاظ میں	۲۰۰
۱۵۱	روحانی وجسمانی حسن وقبح کے احتمالات	//
۱۵۲	کیا اخلاق قابل اصلاح ہیں؟	۲۰۱
۱۵۳	یونانی فلاسفہ کا خیال	//
۱۵۴	عیسائیت کا نظریہ	۲۰۲
۱۵۵	اخلاق کی اصلاح وعدم اصلاح کے اقوال میں افراط وتفریط	۲۰۳
۱۵۶	اسلامی نظریہ	//
۱۵۷	اسلام اخلاقی سرچشموں کے ازالہ کے بجائے امالہ کا قائل ہے	۲۰۴
۱۵۸	اخلاقی قوتوں کے ازالہ وامالہ کی تفصیل سے احادیث میں تطبیق	۲۰۵
۱۵۹	انسان میں تین اخلاقی قوتیں اور ان کی تعریفیں	۲۰۶

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
۲۰۶	قوت شہویہ، غضبیہ، عقلیہ کے تین درجات	۱۶۰
۲۰۷	قوت شہویہ کا افراط	۱۶۱
″	قوتِ شہویہ کا درجہ تفریط	۱۶۲
″	قوتِ شہویہ کا درجہ اعتدال	۱۱۳
۲۰۸	قوتِ غضبیہ کا افراط، تفریط، اعتدال	۱۶۴
۲۰۹	قوتِ عقلیہ کا درجہ افراط، تفریط، اعتدال	۱۶۵
۲۱۰	یورپ کے قابل تعریف علوم اور یورپی اہلیت	۱۶۶
۲۱۲	تین قوتوں میں اعتدال کے لئے ایک چوتھی قوتِ عادلہ کی ضرورت	۱۶۷
″	یونانی فلسفۂ اخلاق کی کتب اور اسلامی اخلاق	۱۶۸
۲۱۳	اسلامی اخلاق کی بنیاد صفت حیا پر ہے	۱۶۹
۲۱۴	صفتِ حیا کی تعریف	۱۷۰
″	حیا اور جبن میں فرق	۱۷۱
۲۱۵	سورۂ فاتحہ سے اخلاق کا استنباط	۱۷۲
″	خلق اوّل	۱۷۳
۲۱۶	خلق ثانی	۱۷۴
″	خلق ثالث	۱۷۵
″	خلق رابع	۱۷۶
۲۱۷	خلق خامس	۱۷۷

نمبر شمار	عنوانات	بر صفحہ
۱۷۸	خلق سادس	۲۱۸
۱۷۹	قناعت پر ایک واقعہ	″
۱۸۰	خلق سابع	۲۱۹
۱۸۱	حکمت کی تعریف	″
۱۸۲	سورۃ فاتحہ کی معاشرتی تفسیر	۲۲۰
۱۸۳	معاشرہ کی لفظی تحقیق	″
۱۸۴	متکلمین کے نزدیک معاشرہ کی تعریف	۲۲۲
۱۸۵	سورۃ فاتحہ اور اصلاح معاشرہ کے اصول	۲۲۱
۱۸۶	الاصل الاوّل (اصل نمبر ۱)	۲۲۲
۱۸۷	الاصل الثانی (اصل نمبر ۲)	″
۱۸۸	دوسروں کے ساتھ احسان بنسبت اپنی ذات کے زیادہ مفید ہے	۲۲۳
۱۸۹	اجتماعی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینا کائناتی فلسفہ ہے	″
۱۹۰	دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا ایک عنوان ایثار بھی ہے	۲۲۴
۱۹۱	اسلامی دور میں احسان و ایثار کی مثالیں	۲۲۵
۱۹۲	الاصل الثالث (اصل نمبر ۳)	۲۲۷
۱۹۳	شفقت کی مثالیں	″
۱۹۴	الاصل الرابع (اصل نمبر ۴)	۲۲۸
۱۹۵	الاصل الخامس (اصل نمبر ۵)	۲۲۹

بر صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۲۲۹	صالح معاشرہ کے لئے اطاعتی نظام لازمی امر ہے	۱۹۶
۲۳۰	الاصل السادس (اصل نمبر ۶)	۱۹۷
″	انسانی زندگی کا نظام باہم تعاون سے قائم ہے	۱۹۸
۲۳۱	الاصل السابع (اصل نمبر ۷)	۱۹۹
″	الاصل الثامن (اصل نمبر ۸)	۲۰۰
۲۳۲	مُصلح کو انعام اور مُفسد کو سزا خدائی حکومت کا قانون ہے	۲۰۱
″	فاروقی دور کا ایک واقعہ	۲۰۲
۲۳۴	غیر اسلامی سزائیں انسانی فطرت کے مطابق نہیں	۲۰۳
۲۳۵	سورۃ فاتحہ کی عرفانی تفسیر	۲۰۴
″	سیر روحانی و جسمانی	۲۰۵
″	سیر جسمانی کی ضروریات	۲۰۶
۲۳۶	انتخاب الطریق الموصل	۲۰۷
″	قطع المسافت	۲۰۸
″	عدم الانحراف فی اثناء الطریق	۲۰۹
″	سیر روحانی کی تفصیلات	۲۱۰
۲۳۷	سیر الی اللہ میں حائل حجابات کی تفہیم کے لئے ایک مثال	۲۱۱
۲۳۸	حجابات اربعہ کی حقیقت	۲۱۲
″	حجاب الغفلۃ	۲۱۳

نمبر شمار	عنوانات	برصفحہ

۲۱۴ ـ حجاب الجہل ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۲۳۹
۲۱۵ ـ حجاب الرسم ـ ـ ـ ـ ـ ـ 〃
۲۱۶ ـ حجاب خوف و رجا من غیر اللہ تعالیٰ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۲۴۰
۲۱۷ ـ سُورۃ فاتحہ سے سلوک کے کُلیات کا استخراج ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۲۴۱
۲۱۸ ـ سُورۃ فاتحہ کی سیاسی تفسیر ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۲۴۴
۲۱۹ ـ سیاست کی تعریف ـ ـ ـ ـ ـ ـ 〃
۲۲۰ ـ سیاستِ الٰہیہ اور انسانی سیاست ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۲۴۵
۲۲۱ ـ خلفاء نبوّت کی سیاست ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۲۴۶
۲۲۲ ـ آیتِ استخلاف اور خلفاء راشدین ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۲۴۹
۲۲۳ ـ ملوکیت اور اسلام ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۲۵۰
۲۲۴ ـ ملوکیت کا فساد ـ ـ ـ ـ ـ ـ 〃
۲۲۵ ـ قابلِ تعریف ملوکیت ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۲۵۱
۲۲۶ ـ حدیث میں ظل اللہ کا مطلب ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۲۵۲
۲۲۷ ـ نظامِ حکومت کا استحکام ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۲۵۳
۲۲۸ ـ عدم استحکام کا سبب ـ ـ ـ ـ ـ ـ 〃
۲۲۹ ـ فسادِ داخلی کیسے برپا ہوتا ہے؟ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۲۵۴
۲۳۰ ـ فسادِ داخلی کا انسداد کیسے ہو؟ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۲۵۵
۲۳۱ ـ تسخیر لسان مع تسخیر جنان ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۲۵۶

نمبر شمار	عنوانات	بر صفحہ
۲۳۲	سیاست میں تسخیر جنان کے اُصول	۲۵۶
۲۳۳	اعداد فوائد دنیویہ	۲۵۸
۲۳۴	اعداد فوائد دینیہ	۲۶۱
۲۳۵	لمحہ فکریہ	۲۶۲
۲۳۶	انصاف مہیا کرنا	〃
۲۳۷	فسادِ خارجی	۲۶۳
۲۳۸	انسداد فسادِ خارجی	۲۶۴
۲۳۹	مرکز اطاعت ایک نہ ہونے کے نتائج عالمی واقعات کی روشنی میں	〃
۲۴۰	نصب العین اساسی	۲۷۰
۲۴۱	جہاد، نصب العین کے حصول کا ذریعہ	〃
۲۴۲	صحابہ کرام رض ملکوں کے ساتھ دلوں کو بھی فتح کرتے تھے	۲۷۱
۲۴۳	تفسیر الفاتحۃ من جھۃ ضرورۃ القرآن	۲۷۵
۲۴۴	حمد کے لئے کمالات کا علم ضروری ہے	〃
۲۴۵	روحانی تربیت جسمانی تربیت سے اہم ہے	۲۷۷
۲۴۶	رُوح عالم آمر سے آئی ہے	〃
۲۴۷	قرآنی تعلیم کی ضرورت	۲۷۸
۲۴۸	مجازاتِ اعمال کے عقیدے سے قرآن کی ضرورت	۲۷۹
۲۴۹	اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے علم کے لئے ضرورۃ قرآن	۲۸۱

نمبر شمار	عنوانات	بر صفحہ

۲۵۰ — امداد خداوندی کے علم کے لئے ضرورت قرآن ---- ۲۸۲
۲۵۱ — صراط مستقیم کا علم بھی اللہ تعالیٰ کے بتانے پر موقوف ہے ---- //
۲۵۲ — تفسیر الفاتحہ من حیث کونہا جامعۃ للعلوم الاسلامیہ ۲۸۴
۲۵۳ — حل الشبہات الواردۃ علی الفاتحہ ---- ۲۸۸
۲۵۴ — (سورہ فاتحہ پر کئے گئے گیارہ اعتراضات کے جوابات) //
۲۵۵ — الشبہۃ الاولیٰ ---- ۲۸۹
۲۵۶ — الجواب ---- //
۲۵۷ — الشبہۃ الثانیۃ ---- ۲۹۰
۲۵۸ — الجواب ---- ۲۹۱
۲۵۹ — الشبہۃ الثالثۃ ---- ۲۹۲
۲۶۰ — الجواب ---- //
۲۶۱ — الشبہۃ الرابعۃ ---- ۲۹۴
۲۶۲ — الجواب ---- ۲۹۵
۲۶۳ — الشبہۃ الخامسۃ ---- //
۲۶۴ — الجواب ---- ۲۹۶
۲۶۵ — الشبہۃ السادسۃ ---- //
۲۶۶ — الجواب ---- ۲۹۷
۲۶۷ — الشبہۃ السابعۃ ---- ۲۹۹
۲۶۸ — الجواب ---- //
۲۶۹ — الشبہۃ الثامنۃ ---- ۳۰۴
۲۷۰ — الجواب ---- //
۲۷۱ — الشبہۃ التاسعۃ ---- ۳۰۵

برصفحه	عنوانات	نمبر شمار
٣٠٦	الجواب	٢٧٢
〃	الشبهة العاشرة	٢٧٣
٣٠٧	الجواب	٢٧٤
٣٠٨	الشبهة الحادية عشر	٢٧٥
٣٠٩	الجواب	٢٧٦
٣١٢	خاتمة الكتاب	٢٧٧

راقم ڈاکٹر کرنل قاری فیوض الرحمن جدون کا بھی تہ دل سے شکرگزار ہے جنہوں نے زُبانی اور متعدد مرتبہ بذریعہ خطوط درسِ فاتحہ کی تکمیل کی طرف میری توجہ مبذول کرائی اور پھر میرے برادرِ خورد محمد یوسف عباسی اور مولانا حافظ عبدالرحمن چغرزئی امام جامع مسجد نیلا گنبد لاہور کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مسودے کی تیاری میں میرا ہاتھ بٹایا۔

اور الحاج بشیر احمد بشیر اینڈ برادرز پلاسٹک انارکلی لاہور اور ان کے تمام ساتھیوں کی طباعتِ کتاب میں خصوصی دلچسپی بھی لائق مبارکباد ہے۔

اور آخر میں بھائی محمد حسین خاور گیلانی (خوشنویس) بھی شکریہ کے مستحق ہیں جن کی شبانہ روز محنتِ شاقہ سے کتاب تکمیل پذیر ہوئی، دُعا ہے کہ اللہ ربّ العزت موصوف کو دین و دنیا کی کامیابیوں سے نوازے۔

راقم ایک بار پھر ان تمام حضرات کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے اور ان کی دنیا و آخرت کی کامیابیوں کے لئے دُعاگو ہے۔

طالبِ دُعا

الاحقر علی اصغر العباسی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفسیر تعوّذ

یعنی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○

مُفسّرین حضرات قُرآن کریم کی تفسیر استعاذہ سے شروع کرتے ہیں چُنانچہ امام رازی ؒ اور علامہ آلوسیؒ نے ایسا ہی کیا ہے اصل بُنیاد تو قرآن پاک کی یہ آیت ہے۔

اِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ - جب تم قرآن پاک پڑھو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ لے لیا کرو۔

جس طرح تلاوت میں استعاذہ مقدم ہے[۱]، یوں ہی تفسیر میں بھی مقدم ہونا مناسب ہوگا۔

تعوّذ کے تحت مباحث

اعوذ باللہ الخ کے تحت حسب ذیل عنوانات کا بیان ہوگا۔

۱۔ سرِّ تقدیم، یعنی تعوّذ تسمیہ سے پہلے کیوں ہے؟

۲۔ سرِّ تخصیص: صرف شیطان ؒ سے پناہ کیوں جبکہ دشمن اور بھی ہیں؟

---

[۱] تلاوت قرآن پاک سے پہلے تعوذ کا پڑھنا قرآنی حکم کی تعمیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے مگر کبھی کبھار اس کا ترک بھی ہوتا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اس لئے امت کے جمہور علماء نے اس حکم (صیغہ امر) کو واجب نہیں بلکہ سنت قرار دیا ہے اور امام ابن جریر طبریؒ نے اس پر اجماع امت نقل کیا ہے کہ تلاوتِ قرآنِ پاک کے علاوہ کسی دوسری کتاب یا کلام پڑھنے سے قبل تعوذ پڑھنا سنت نہیں بلکہ تسمیہ کا پڑھنا کافی ہوگا (معارف القرآن ج ۵۔ ص ۳۸۹) قرآن پاک کی تلاوت سے قبل استعاذہ کا صرف پڑھنا سنت ہے اور قرآن پاک کے شروع میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ کرامؓ سے لکھنا چونکہ ثابت نہیں اسلئے تعوذ کو شروع میں لکھا نہیں جاتا (خلاصۃ التفاسیر ج ۱۔ص ۲۰۔ علی اصغر عفی عنہ)

۳۔ سِرِّ تدبیر ـــــ اولادِ آدم کے خلاف شیطانی تدابیر کیا ہیں؟

۴۔ سِرِّ تاثیر ـــــ ایک جملے سے شیطان کیسے شکست کھاجاتا ہے؟

۵۔ سِرِّ وجود ـــــ وجودِ شیطانی کے عقلی و نقلی دلائل۔

۶۔ سِرِّ تخلیق ـــــ شیطان کو پیدا کرنے کی حکمت کیا ہے۔

ان تفصیلات سے قبل اَعُوْذُ بِاللّٰہِ الخ کے مفردات کی تشریح مناسب ہوگی وَھُوَ ھٰذا

استعاذہ کے مفردات کی تشریح

اَعُوْذُ، عَاذَ، یَعُوْذُ سے واحد متکلّم مضارع معروف کا صیغہ ہے اور اس کا مصدر اَلْعَوْذ ہے جس کا معنی اَلْاِلْتِجَاءُ لِدَفْعِ اَلْمَضَرَّۃِ۔ (تکلیف دہ چیز کو ہٹانے اور دور کرنے کے لئے درخواست کرنا) اس کا متقابل لَلَوْذ ہے جس کے معنی ہیں اَلْاِلْتِجَاءُ لِجَلْبِ الْمَنْفَعَۃِ۔ (فائدہ حاصل کرنے کی خاطر درخواست کرنا) چنانچہ مشہور شاعر متنبی نے اپنے ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے ان دونوں متقابل الفاظ کو اپنے ایک شعر میں جمع کردیا ہے۔ شعر یہ ہے۔

اِنِّیْ اَلُوْذُ بِہٖ مِمَّا اُؤَمِّلُہٗ ؛ وَمَنْ اَعُوْذُ بِہٖ مِمَّا اُحَاذِرُہٗ۔

(میں اپنی امیدوں میں ممدوح سے درخواست کرتا ہوں اور ان تمام چیزوں سے میں اس کی پناہ چاہتا ہوں جو میرے لئے خطرے کا باعث ہیں۔

معلوم ہوا کہ امید کے موقع پر اَللَّوْذ اور خوف کے موقعہ پر اَلْعَوْذ کا استعمال ہوتا ہے۔

لفظ اللہ کی تشریح و تفصیل بِسْمِ اللّٰہِ میں آئے گی اس لئے کہ اس کا صحیح مقام وہ ہی ہے۔

شیطان۔ اگر نون زائد ہو تو اس کی اصل شَاطَ، یَشِیْطُ، شَیْطًا کے وزن پر ہوگی جس کے معنی احتراق (جلنے) کے ہیں لِاَنَّ الشَّیْطَانَ یَحْتَرِقُ مِنَ الْاِنْسَانِ غَضَبًا وَحَسَدًا۔ (یعنی شیطان چونکہ انسان کی دشمنی اور حسد میں جلتا ہے اس لئے اس کا یہ نام ہوا اور اگر نون اصلی ہو تو (۲)، شَطَنَ یشطن شَیطنًا اس کی اصل ہوگی۔ جس کے معنی بُعْد

کے ہیں۔

لِاَنَّ الشَّیْطَانَ بَعِیْدٌ مِنَ الْمَلَاءِ الْاَعْلٰی ۔ شیطان چونکہ ملاءِ اعلیٰ سے دور ہے اللہ کی
بَعِیْدٌ مِنْ رَحْمَتِ اللّٰہِ۔ بَعِیْدٌ مِنْ مَحَبَّۃِ الْاِنْسَانِ ۔ رحمت سے دور ہے انسانی محبت سے دور ہے

اَلرَّجِیْم

یہ رجام سے مشتق ہے۔ رجام پتھر کو کہتے ہیں جبکہ رجیم پتھر سے مارے ہوئے کو کہتے ہیں۔ (فعیل بمعنی مفعول ہے) چونکہ کسی کو پتھر سے مارنا اظہارِ نفرت ہے اسی لئے اردو میں اس کا معنی "مردود" کیا جاتا ہے۔

تنبیہ ۔ بعض ناواقف لوگ ترجمہ والے قرآن پاک کو مُتَرْجَم (رجیم مشدّد) قرآن کہہ دیا کرتے ہیں یہ درست نہیں ہے اس لئے کہ اس صورت میں معنی ہوگا پتھراؤ کیا ہوا جو غلط ہے (اللہ کی پناہ) ترجمہ والے قرآن پاک کو قرآن مُتَرْجَم کہنا چاہیئے یعنی ترجمہ شدہ قرآن ۔ ترجمہ کا مادہ بھی رجم ہے، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ سنگساری سے مرحوم کی حالت کا اظہار مقصود ہوتا ہے یعنی اس کی پوشیدہ حالتِ جرم کو ظاہر کیا جاتا ہے اور ترجمہ کا مقصد بھی امر مخفی کو ظاہر کرنا ہوتا ہے جو قرآنی الفاظ میں مستور ہوتا ہے۔

تعوّذ کی جامعیت

تَعَوُّذ مندرجہ ذیل چار چیزوں کا جامع ہے۔
۱۔ مستعیذ ۲۔ مستعاذ بہ ۳۔ مُسْتَعَاذ منہ ۴۔ مستعاذ لہ۔ اَعُوْذُ میں امر اوّل کا بیان ہے یعنی پناہ مانگنے والا انسان ہے اور بِاللّٰہِ میں امر ثانی مُسْتَعَاذ بِہٖ کا ذکر ہے یعنی جس کی پناہ لی جا رہی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی ہے۔ مِنَ الشَّیْطَانِ میں امر ثالث مستعاذ منہ کا بیان ہے یعنی جس کے شر سے پناہ مانگی جا رہی ہے وہ شیطان ہے۔ لیکن امر چہارم مستعاذ لہٗ کا ذکر بظاہر نہیں ہے یعنی وہ امر جس کی وجہ سے پناہ مانگی جا رہی ہے اس کا الگ بیان

پیدا وار ہے اس لیے اس نے یورپ کو نتائج ناریہ بخشے ہیں مثلاً ایٹم بم ہائیڈروجن بم جیسی تباہی
نے والی ہلاکت خیز چیزیں. میری نوٹ بک میں ایک انگریز مصنف کا قول درج ہے کہ یورپی انسان
لغ ہے اور بچے کی طرح ہے جس طرح ایک بچہ اپنی خواہش کے خلاف ہر چیز کو پھینک دیتا ہے.
ں ہی مغربی انسان اپنی خواہش کے آڑے آنے والی چیزوں کے خلاف ہے.

عوذ باللہ میں واحد کا صیغہ کیوں استعمال ہوا ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

یہاں ایک سوال یہ ہے کہ اعوذ واحد کا صیغہ کیوں لایا گیا ہے جبکہ قرآن پاک میں دعا کے مواقع
ں عموماً جمع کے صیغے آئے ہیں صرف سورۃ فاتحہ میں ہی نعبد، نستعین، اھدنا
یرہ جمع کے صیغے ہیں اس کے جواب میں تمام مفسرین بالکل خاموش ہیں لیکن بات ضرور قابل غور ہے
حدت کا نکتہ کیا ہے؟ اس ضمن میں بہت جستجو کی اور جب کہیں بھی جواب نہ ملا تو میں نے آخر میں اللہ
الی سے دعا کی کہ یا اللہ باقی تو ہی رہ گیا ہے تو ایک بات فوراً قلب پر وارد ہوئی جس کا حاصل یہ ہے
شیطان کے مقابلے میں جماعت بھی فرد کی طرح ہے گویا جماعت ہے ہی نہیں بلکہ انسان شیطان
دشمنی میں تنہا ہے جماعت یہاں بیکار ہے اگر شیطان کے علاوہ کوئی انسان دشمن ہو تو پھر فرد اور
ماعت کے احکام مختلف ہوں گے اکیلا انسان جماعت کے مقابلہ میں مغلوب ہوتا ہے جیسے دنیا
یں چھوٹی جماعت بڑی اور طاقتور جماعت کے مقابلے میں مغلوب ہوتی ہے. لیکن یہاں ہمارا
یک ایسے دشمن سے پالا پڑا ہے کہ جماعت اس کے آگے فرد واحد کے برابر ہے کیونکہ شیطان غیر
رئی (نظر نہ آنے والا) دشمن ہے جہاں جماعت کالعدم ہے بلکہ جماعت بھی فرد کے برابر ہے
س لیے شیطان کے مقابلے میں ہر ہر فرد کو اپنا اپنا بچاؤ کرنا ہوگا اس حقیقت کو واضح کرنے کے
لیے تعوذ میں اعوذ واحد کا صیغہ لا کر ایک ایک فرد انسانی کو اپنے بچاؤ کی ترغیب دی گئی ہے یہ
ہے وحدت کا نکتہ والعلم الحقیقی عند اللہ تعالیٰ وھو اعلم.

اعوذ باللہ میں با کی حقیقت

اعوذ کے بعد با لائی گئی ہے با کے بہت سے معنی

ہیں لیکن سیبویہ نے لکھا ہے کہ باء کا اصل معنی اِلْصَاق (ملانا) ہے باقی معانی اسی کی شاخیں ہیں اس صورت میں معنی ہوگا کہ میں اللہ سے تعلق جوڑ کر پناہ چاہتا ہوں۔ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ تحفظ من[1] القوی کے لیے ارتباط[2] بالقوی کی ضرورت ہوتی ہے چونکہ ہمارا دشمن قوی ہے اور ہم ضعیف ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات قوی تر ہے اور سب سے بڑھ کر ہے اس سے ارتباط کی ضرورت ہے شیطان کی دشمنی سے بچاؤ صرف ان تدابیر سے ممکن ہے جو اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی ہیں باقی سب بیکار۔ تو اَعُوْذُ بِاللّٰہِ میں باجو اِلْصَاق کے لئے ہے اس سے ارتباط بالقوی کا اصول نکلا ہے۔

سِرِّ تقدیم

یعنی تعوذ تسمیہ سے مقدم کیوں ہے اور اس کی حکمت کیا ہے؟

تعوذ کی تقدیم کی یہاں وجہ تو یہ ہے کہ ارشاد خداوندی یوں ہے فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ - یعنی قرأت قرآن سے پہلے اعوذ باللہ پڑھا کرو۔ چنانچہ مفسرین نے آیت کا معنی یوں بیان کیا ہے کہ اِذَا اَرَدْتَ قِرَاءَۃَ الْقُرْاٰنِ[3] معلوم ہوا کہ قرأت قرآن متاخر ہے جبکہ تعوذ مقدم ہے نیز قرأت فی الصلوٰۃ میں بھی باتفاق ائمہ اربعہ تعوذ تسمیہ سے مقدم ہے خلاصہ یہ کہ حکم خداوندی یوں ہی ہے باقی اس کا راز کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے نفع و نقصان کی حقیقت معلوم کرنا ضروری ہے۔ جس کے لئے درج ذیل مقدمات کو بغور پڑھنے کی ضرورت ہے۔

مضرت و منفعت کی حقیقت

منفعت کی حقیقت یہ ہے تَحْصِیْلُ مَا هُوَ فِی الْمُسْتَقْبَلِ۔ یعنی جو چیز آئندہ آنے والی ہے اس کا حاصل کرنا جبکہ مضرت کی حقیقت ہے تَفْوِیْتُ مَا هُوَ

---

[1] طاقت ور سے بچاؤ۔ [2] طاقت ور سے جوڑ۔ [3] جب تم تلاوت قرآن کا ارادہ کرو تو اعوذ باللہ پڑھ لیا کرو۔

فی الحال۔ یعنی فی الحال کسی چیز کا فوت ہونا یا ضائع اور زائل ہونا اس سے یہ بات واضح ہوئی، منفعت غیر موجود چیز کو حاصل کرنے کا نام ہے جبکہ مضرت موجود چیز کا تلف ہونا ضائع ہونا ہے۔ مثلاً تجارت میں نفع ایک غیر موجود چیز ہے جس کا حصول منفعت ہے اور راس المال جو موجود ہے اس کا ضائع ہونا مضرت ہے۔

دفع مضرت اور جلب منفعت کا تقابل

فلسفیانہ طور پر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دفع مضرت جلب[1] منفعت سے مقدم ہے۔ مثلاً ایک انسان بیمار ہے تو پہلے مرض کو دور کرنے کا علاج کیا جائے گا پھر چونکہ مرض میں صحت بھی کمزور ہو جاتی ہے تو اس کی فکر مرض کے ازالہ کے بعد ہوگی مرض کا ازالہ دفع مضرت ہے جبکہ صحت کی بحالی جلب منفعت ہے اس مثال سے دفع مضرت کی تقدیم کا قاعدہ معلوم ہوا کہ دفع مضرت کی فکر کا مقدم ہونا ایک عقلی تقاضا ہے

(۳) مضرت کثیرہ اور منفعت قلیلہ کا تقابل

عرف عام اور عقل صحیح کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ اگر مضرت کثیرہ اور منفعت قلیلہ کا تقابل ہو جائے تو مضرت کثیرہ کا ازالہ اہم اور مقدم ہوگا بنسبت منفعت قلیلہ کے حصول کے۔ مثال کے طور پر ایک دوکاندار اور تاجر کے پاس گاہک آتا ہے دوکاندار کا اندازہ ہے کہ اس کو سودا دینے میں سو روپے کا فائدہ ہے اور گاہک نے سودا اسی وقت خریدنا ہے تاخیر کی صورت میں گاہک کسی دوسرے دوکاندار کے پاس چلا جائے گا۔ عین اسی وقت دوکاندار کو اطلاع ملتی ہے کہ تیرے مکان کو آگ لگ گئی ہے یقینی بات ہے ایک عقلمند دوکاندار گاہک سے منفعت قلیلہ کے حصول کو چھوڑ کر گھر کی آگ کو بجھانے کی مضرت کثیرہ کے ازالہ کی فکر کرے گا۔ اس لئے کہ سو روپے کا فائدہ ایک قلیل نفع ہے جبکہ مکان جل جانے کی صورت میں ہزاروں روپے نقصان ہونے کا خطرہ ہے الغرض یہ ایک طے شدہ ضابطہ ہے کہ ازالہ مضرتِ کثیرہ منفعت قلیلہ کے حصول کے مقابلے میں اہم بھی ہے اور مقدم بھی یہ تین مقدمات سمجھنے کے بعد شیطان

[1] تکلیف کو دور کرنا اور فائدہ حاصل کرنا۔

کی مضرت کو سمجھنا آسان ہوگیا ہے۔

شیطانی مضرت کی اہمیت

استعاذہ کی حقیقت یہ ہے اَلتَّحَفُّظ مِن مضرّۃِ الشَّیطان ۔ یعنی شیطان کی دشمنی سے بچاؤ اور تسمیہ کی حقیقت حدیث پاک کی روشنی میں برکت کا حصول ہے گویا استعاذہ میں دفع مضرت ہے جبکہ تسمیہ میں جلب منفعت ہے اور یہ مسلّمہ اصول ہے کہ دفع مضرت جلب منفعت سے مقدم ہوتا ہے اس لئے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ سے مقدم ہے۔
یہ بھی اوپر معلوم ہوگیا ہے کہ منفعت کا تعلق غیر موجود کو حاصل کرنے سے ہے جبکہ دفع مضرت میں موجود مضرت کو زائل کرنا ہوتا ہے اس لحاظ سے بھی اگر شیطانی مضرت سے بچاؤ پہلے نہ ہوا تو تسمیہ کا فائدہ یعنی دنیوی برکت غیر موجود چیز ہے اس لئے بچاؤ کی فکر پہلے کرتے ہوئے استعاذہ مقدم ہے تسمیہ پر۔

علاوہ ازیں شیطان چونکہ ایمان کا دشمن ہے اگر خدانخواستہ شیطان کا داؤ چل گیا جس کا تحفظ استعاذہ سے کیا جاتا ہے تو پھر تسمیہ کا فائدہ قلیلہ کی کیا حیثیت رہ جائے گی اسی بنا پر اوپر عقلی قاعدہ بتایا گیا ہے کہ مضرت کثیرہ کا ازالہ مقدم ہوا کرتا ہے منفعتِ قلیلہ پر چونکہ استعاذہ میں مضرتِ کثیرہ کا ازالہ ہے اس لئے وہ مقدم ہے منفعت قلیلہ پر جو تسمیہ سے ہوتا ہے۔

مقدمہ نمبر ۴

قلیل الاسباب چیز اہم ہوتی ہے

نیز ایک عقلی اصول یہ ہے کہ کثیر الاسباب چیز کی نسبت قلیل الاسباب چیز کی اہمیت اور فکر زیادہ ہوتی ہے اس قاعدہ کے مطابق شیطانی مضرت سے بچاؤ کا سبب صرف استعاذہ ہے یہاں کوئی ظاہری اسباب بھی نہیں ہیں جبکہ بسم اللہ جہاں ایک روحانی سہارا ہے وہاں اس کے مادی اسباب بھی موجود ہیں مثلاً تاجر تجارت کرتے ہوئے برکت کے حصول کے لئے بسم اللہ پڑھے گا کسان زراعت کرتے وقت برکت کیلئے بسم اللہ پڑھے گا کھانے والا پینے والا کھاتے

ہوئے ۔ بیٹھتے ہوئے برکت کے حصول کے لیئے بسم اللہ پڑھے گا تو یہاں دو سبب ہیں ایک مادی ایک روحانی جبکہ مضرت شیطانی کے ازالہ اور بچاؤ کا صرف ایک ہی روحانی سبب ہے اور وہ استعاذہ ہے یہاں ظاہری اسباب بے کار ہیں شیطان سے بچاؤ کی صورت صرف روحانی سبب سے ہے ایک مثال سے اس کی مزید وضاحت کی جاتی ہے ۔

مثال :۔ مثال کے طور پہ فرض کیا جائے کہ ایک آدمی اندرونِ ملک یا بیرون ملک سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اگر منزل مقصود تک جانے کے لیئے اسباب زیادہ ہوں گے تو وہ فکر زیادہ نہیں کرے گا اور اگر منزلِ مقصود تک پہنچنے کے اسباب کم ہوں تو مسافر کو فکر مندی زیادہ ہو گی مثلاً ایک جگہ دن میں دس گاڑیاں جاتی ہیں تو مسافر کو زیادہ فکر نہ ہو گی لیکن اگر ایک ہی گاڑی جانے والی ہو تو مسافر فکر مند ہو گا اور وقت سے پہلے پہنچنے کی فکر کرے گا اور پوری کوشش سے سوار ہو گا اب اس مثال کی روشنی میں یوں سمجھیئے کہ دنیوی فوائد کے اسباب بہت ہیں مگر شیطانِ مردود کی دشمنی سے بچاؤ کا سبب صرف ایک ہے اور وہ اعوذ باللہ کہنا ہے اس لیئے اس کی اہمیت زیادہ ہو گئی اور تسمیہ پہ اس کی تقدیم ضروری تھی ۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دفع مضرت اور جلب منفعت کا تقابل ہو یا مضرتِ کثیرہ اور منفعتِ قلیلہ کا تقابل ہو یا پھر قلیل الاسباب اور کثیر الاسباب چیزوں کا تقابل ہو تینوں صورتوں میں استعاذہ کی تقدیم تسمیہ پر ضروری ثابت ہوئی ۔

تعوّذ کی تقدیم کا ایک صُوفیانہ نکتہ

تقدیم استعاذہ بر تسمیہ کے ضمن میں

کسی صوفی نے بہت دلچسپ نکتہ بیان کیا ہے گو علماء اس کو پسند نہ کریں مگر اپنا اپنا ذوق ہے وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ اعوذ باللہ الف سے شروع ہو رہا ہے اور الف کا مقام اولیت ہے جبکہ بسم اللہ کی ابتداء با سے ہو رہی ہے اور با کا مقام ثانی ہے اس اعتبار سے الف کی تقدیم با پہ ضروری تھی لھذا اعوذ باللہ کو بسم اللہ پر تقدیم حاصل ہے ۔

سِرِّ تخصیص

یعنی اعوذ باللہ من شیطان سے۔ بچاؤ کا طریقہ بنایا گیا ہے جبکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کے دشمن اور بھی بہت ہیں۔ دنیا میں جس قدر بھی اشیاء ضارّہ یا نافعہ ہیں ان سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن پاک میں فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ (پناہ چاہو اللہ تعالیٰ کی شیطان مردود سے) فرما کر استعاذہ کا حکم دیا گیا ہے دنیا کی تمام نقصان دہ اشیاء میں سے صرف شیطان کا انتخاب کیوں فرمایا گیا ہے اور تمام مضرات میں سے اس کو مستعاذ منہ کے درجہ میں رکھا گیا ہے اس کی حکمت اور مرجع کیا چیز ہے؟ بس وہی چیز تَعَوُّذ مِنَ الشَّيْطَان کی سِرِّ تخصیص ہے۔

مُضرات کے درجات

جواب سے پہلے نفع و نقصان کی حقیقت کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم انسان کے وجود کے نقصانات کے لحاظ سے تجزیہ کریں تو مندرجہ ذیل سلسلہ وار چار قسم کی مضرتوں کا تصوّر ہو سکتا ہے۔

۱۔ مضرتِ ثوبی: یعنی کپڑے کو نقصان پہنچے مثلاً پھٹ یا جل جائے۔

۲۔ مضرتِ جسمی: یعنی بدن انسانی زخمی ہو جائے یا کٹ جائے۔

۳۔ مضرتِ روحی: یعنی روح کو نقصان پہنچے۔ مثلاً جسم سے الگ ہو جائے۔

۴۔ مضرتِ روح الرّوحی: یعنی ایمان یا ایمانیات متاثر ہوں۔

ترتیب کے لحاظ سے مضرت ثوبی سے بڑھ کر نقصان مضرت جسمی کا ہے اور بدنی مضرت سے روحی مضرت بڑھ کر ہے جبکہ مضرت روحی سے بڑھ کر مضرت روح الرّوحی ہے کپڑے کا بقا بدن انسانی سے ہے اگر جسم نہ ہو تو کپڑا کس کو پہنایا جائے گا اور بقاء بدن روح سے ہے۔ اگر روح نہ ہو تو بدن اجزائے منتشرہ کے مجموعے کا نام ہے رہا یہ امر کہ روح الرّوح کیا ہے؟ تو میری مراد یہاں ایمان اور طاعات ہیں یعنی دینی احکامات روح الرّوح ہیں قرآن پاک کی ایک آیت

سے روح الرّوح کا پتہ چلتا ہے ارشاد باری ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ. الآية

اے ایمان والو کہا مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا جب تم کو اس چیز کی طرف بلائیں جو تمہیں حیات بخشے،

یقینی بات ہے کہ اللہ اور رسول کا بلاوا کھانے پینے کی طرف نہیں بلکہ ایمان اور طاعات کی طرف ہے جو حیاتِ ایمانی کا سبب ہے جس طرح جسم کی زندگی روح سے ہے اس آیت سے معلوم ہوا کہ روح کی زندگی ایمان اور اس کے تقاضے پورے کرنے سے ہے ہم نے اسی کو روح الرّوح کا نام دیا ہے۔

حیاتِ طیبہ کی حقیقت

یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ آیت بالا سے اس حقیقت کا پتہ چلا کہ ایک مومنِ مطیع کے پاس حیات کے دو سامان ہیں ایک روح جس سے جسمانی زندگی قائم ہے اور دوم روح الرّوح۔ دنیا کی زندگی ہیں جس کے پاس یہ دونوں حیات کے سامان ہوں وہ صاحب حیاتِ طیبہ ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں سورۃ نحل آیت نمبر ۹۷ میں فرمایا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔

جس نے کیا نیک کام مرد ہو یا عورت ہو۔ بشرطیکہ وہ مومن ہو تو اس کو ہم زندگی دینگے ایک اچھی زندگی اور بدلے میں دیں گے ان کو حق ان کا بہتر کاموں پر جو کرتے تھے۔

اور جس میں ایمان یا طاعات نہیں وہ قرآنی اصطلاح میں صاحب معیشتِ ضنک ہے جیسے کہ فرمایا:

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا ۔ الآية:

اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کو ملنی ہے گذران تنگی کی،

مفسرین کے بیان کے مطابق ذکر پورے دین کا نام ہے اسی لئے قرآن پاک کا نام بھی ذکر ہے

خلاصہ یہ کہ روح اور روح الرّوح دونوں جمع ہوں تو اس کو حیات طیبہ فرمایا گیا ہے یعنی مزے دار زندگی قناعت اور غنا سے قلبی والی زندگی اور یوں ہی سکون واطمینان ذکر اللہ کی لذت ادا سے فرض عبودیت کی خوشی کامیاب مستقبل کا تصور تعلق مع اللہ کی حلاوت والی زندگی قرآن کے ارشاد کے مطابق صاف ستھری زندگی ہے جو صرف روح سے نہیں بلکہ روح الروح سے حاصل ہوتی ہے اسی کو حیاتِ طیبہ کے عنوان سے ذکر فرمایا گیا ہے۔

محکمۂ اِغواء و اضلال کا انچارج ابلیس

اللہ تعالیٰ نے خاص حکمت کی بنا پر اس عظیم محکمۂ اضلال و اغوار کا انچارج شیطان کو بنایا اس لئے کہ یہ اس فن کا ماہر ہے اگر وہ ماہر فن نہ ہوتا تو اتنے بڑے محکمے کا انچارج کیسے ہوتا؟ قرآن پاک کا اعلان ہے۔

اِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا۔ شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اس کو اپنا دشمن سمجھو۔

بعض عداوتیں زوال پذیر ہوتی ہیں جبکہ شیطانی عداوت زوال پذیر نہیں ذات شیطان سے انسانی عداوت کا انفکاک اسی طرح مشکل ہے جیسے حرارت کا انفکاک آگ سے ایمان کے ہوتے ہوئے شیطانی عداوت ختم نہیں ہو سکتی اوپر اضرار اربع (چار نقصانات) کا ذکر کیا گیا ہے ممکن ہے کہ پہلے تینوں میں بھی اس کو دخل ہو لیکن یہ عدو ماہر ہے اس لئے اس کا اصل نشانہ روح الروح ہے جس کی مضرت مضرت کبریٰ ہے۔ یعنی دین پر ڈاکہ ڈالنا ہے جب روح الروح نہیں تو پھر جسم بھی نہیں اور متعلقاتِ جسم بھی ختم۔ چونکہ حیات طیبہ کا مدار روح الروح پر ہے اس لئے شیطان اس کے درپے ہے صرف روح کی دشمنی اس سے کم درجہ ہے اور سب سے نچلے درجہ کا دشمن مال کا ڈاکو ہے شیطان ایمان کا ڈاکو ہے اس لئے ہم کو استعاذہ کے ذریعہ اس سے بچاؤ کا طریقہ بتایا گیا ہے تو ایک تخصیص کا راز یہ ہوا ۔ باقی توبہ بدنی دشمنوں کے سامنے خوشامد بھی چل جاتی ہے یا اگر رشوت پیش کر دی جائے تو بھی دشمنی مودت میں تبدیل

ہو سکتی ہے اس لئے کہ دیگر اعداء کی عداوت ایک وصفِ عرضی ہے اور شیطان کی عداوت اس کا وصفِ ذاتی ہے اور وصفِ ذاتی ناقابل تغیّر ہے ہاں وصفِ عرضی میں تغیّر ہو سکتا ہے۔

شیطانی عداوت پر امام غزالیؒ کا ایک شاندار جملہ

حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے شیطان کے بارے میں ایک مختصر مگر شاندار جملہ فرمایا ہے جو سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل ہے فرماتے ہیں هُوَ عَدُوٌّ لَا يَقْبَلُ التَّمَلُّقَ وَلَا الرِّشْوَةَ) وہ ایسا دشمن ہے جو خوشامد اور رشوت قبول نہیں کرتا) ہاں ایمان کی رشوت تو اس کا مقصد وحید ہے تو ایسے دشمن سے بچاؤ صرف خالق ہی بتا سکتا ہے انسان صرف اپنے ذہن و دماغ سے شیطان کا دفاع نہیں کر سکتا۔

عدوِّ غیر محسوس

تخصیص کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے جو تحفظِ ایمان کی تدبیر سماوی ہے انسانی اعداء کو تقسیم کیا جائے تو وہ دو قسم کے ہیں ایک عدوِّ محسوس دوم عدوِّ غیر محسوس یہاں شیطان جو مضلِ اعظم اور مغوی اکبر ہے وہ غیر محسوس ہے اور جو دشمن نظر نہ آئے اس کا مقابلہ انسان اپنی تدابیر سے کیسے کر سکتا ہے؟ قرآن پاک میں ایک مقام پر شیطان کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد خداوندی ہے۔

إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۔ الآیۃ

(شیطان اور اس کے اعوان و انصار تمہیں دیکھتے ہیں لیکن تم ان کو نہیں دیکھتے)

تو ایسے دشمن کا مقابلہ جو نظر نہیں آتا تقریباً ناممکن ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس غیر محسوس دشمن کے لئے استعاذہ کی تدبیر از خود بتا دی کہ باقی تو چھوٹے موٹے دشمن ہیں جن سے خدا داد عقل کے ذریعہ تحفظ ممکن ہے لیکن یہ بد بخت ایسا دشمن ہے کہ یہاں تمام عقلی تدابیر فیل ہیں صرف استعاذہ والی خدائی تدبیر ہی قابل عمل ہے۔

(اعاذنا اللہ من شرور الشیطان ۔ علی اصغر) مرتب

رہبر تدبیر

یعنی انسانی اغواء و اضلال میں شیطان کیا تدابیر اختیار کرتا ہے اور اس ضمن میں وہ کونسے ہتھیار استعمال کرتا ہے ؟

بقول حافظ ابن قیمؒ انسانی اغوا و اضلال کے سلسلے میں شیطانی تدابیر دو ہیں (۱) شبہات (۲) شہوات باقی تدابیر انہیں دو کے تحت چلتی ہیں شیطان چونکہ ایمان و طاعات یعنی روح الروح پر ڈاکہ ڈالتا ہے اس لئے سب سے پہلے اس کی تدبیر یہ ہوتی ہے کہ وہ ایمانیات اور طاعات میں شکوک و شبہات پیدا کرتا ہے ایمان چونکہ ناقابل شکست یقین کا نام ہے اس لئے اگر اس میں کروڑواں حصہ بھی شک و تردد پیدا ہو جائے تو ایمان نہ رہا تردد اور ایمان کا اجتماع محلِ واحد میں نہیں ہو سکتا جیسے نجاست و طہارت نور و ظلمت ایک محل میں اکٹھے نہیں ہو سکتے اور شیطان اس حقیقت کو جانتا ہے کہ اگر میں نے ایمانیات میں کروڑواں حصہ بھی شک ڈالدیا تو ایمان ختم ہو گیا اگرچہ انسان اپنے آپ کو مؤمن سمجھتا رہے مگر وہ خدائی فہرست میں مؤمن نہیں رہا چونکہ شک و ایمان میں مصالحت ناممکن ہے اور بقول امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جس پر بالآخر تمام ائمہ متفق ہیں کہ ایمان یقین کے اس آخری درجے کا نام ہے کہ جس کے بعد اضافہ ممکن نہیں [1]

شیطانی شکوک و شبہات کے طرق

شیطان شکوک و شبہات ڈالنے کے لئے مختلف طرق استعمال کرتا ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ یقین کی پختگی ختم ہو جائے اور عقائد پر ایمان کمزور ہو جائے نتیجۃً عقائد کی عملی زندگی پر جو گرفت ہوتی ہے وہ ڈھیلی پڑ جاتی ہے جبکہ یہ ایک حقیقت ہے عملی زندگی پر عقائد کا جس قدر مضبوط کنٹرول ہو گا طاعات میں اسی قدر قوت ہو گی۔ اکبر مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔

---

[1] ایمان بسیط ہے یا مرکب ؟ اس کی وضاحت کے لئے اس سے زیادہ آسان اور سہل تعبیر اور کیا ہو سکتی ہے (لا یزید ولا ینقص) (علی اصغر عفی عنہ)

تمہارے مذہبی دعوے جو کچھ ہیں میں یہ دیکھوں گا
عقیدوں کا اثر محکمہ معیشت پر کہاں تک ہے

عمل عقیدے سے قیمتی بنتا ہے عقائد کے بغیر اعمال کی کوئی حیثیت نہیں۔

الغرض شبہات سے ایمان کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ایمان کے خاتمہ سے طاعات اور نیکیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے کیونکہ بے ایمان کی کوئی نیکی قابلِ قبول نہیں۔ بے ایمانی تو حکومت کبریٰ ی وہ بغاوت ہے جو ساری نیکیوں کو سوخت کر دیتی ہے اس کی نظیر دنیا کی حکومتوں میں بھی ہے کہ دیگر تمام ضوابط پر عمل کے باجود بغاوت کا جرم ناقابلِ معافی ہوتا ہے بعض اوقات گولی ہار دی جاتی ہے کیونکہ قانون ہے کہ بغاوت وہ بدی ہے جس کے بعد کوئی نیکی قابل قبول نہیں۔ شیطانی شبہات نے جب ایمان ختم کر دیا تو طاعات بھی بے قیمت ہو کر ختم ہو گئیں۔ مثال کے طور پر شیطان نے دل میں یہ تصور ڈالا کہ چونکہ حاملین دین کے پاس دنیا کی عزت وجاہ نہیں ہے اور یورپ والوں کے پاس عزت و دولت ہے اس لیے دینداروں کی دینی باتوں کی طرف توجہ نہ دی جائے یہ ڈھکو سلے ہیں (العیاذ باللہ) حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حق بہر حال حق ہے جس کے پاس بھی ہو۔ اگر الماس اور ہیرے کو راکھ میں دبا دیا جائے اور گوبر یا مینگنی کو بلند ترین مقام میں رکھ دیا جائے تو الماس و ہیرے کی قیمت میں کمی نہیں ہو جاتی۔ باطل یورپ کے پاس ہو یا کسی اور کے پاس وہ باطل ہی ہے حق نہیں بنے گا اور حق غریب کے پاس رہ کر بھی حق رہتا ہے

(لَا تَنْظُرْ اِلٰی مَنْ قَالَ وَانْظُرْ اِلٰی مَا قَالَ)

یہ نہ دیکھ کس نے کہا یہ دیکھو کیا کہتا ہے۔

اقسامِ شُبہات

شیطانی شبہ تین طرح کا ہوتا ہے (۱) شبہ فی الانتساب (نسبت میں شبہ) (۲) شبہ فی المنتسب (دین میں شبہ) (۳) شبہ فی حاملِ المُنتَسَبْ

مثال کے طور پر ایک عقیدہ یا عمل قرآن و حدیث میں ہے اور شیطان ایک مومن کے دل کو اس سے پھیرنا چاہتا ہے تو پہلی شیطانی تدبیر یہ ہوتی ہے کہ دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ یہ عقیدہ یا عمل مولوی کا ڈھکوسلہ ہے خدا رسول کا فرمان نہیں۔ شیطان جانتا ہے کہ ایک ایماندار دینی عقائد و اعمال کو اللہ اور رسول کے فرامین سمجھ کر مانتا یا عمل کرتا ہے اس لئے شیطان پہلے یہ شبہ ڈالتا ہے کہ قرآن و حدیث میں ان باتوں کا ذکر نہیں ہے اور اگر کوئی جاننے والا آیت یا حدیث پیش کر دے تو پھر شیطان جدل سے کام لیتا ہے جدل کے معنی تفسیر باطل کے ہیں چنانچہ آپؐ کا ایک ارشاد ہے مَا اَهْلَكَ اللّٰهُ قَوْمًا اِلَّا اُتُوا الْجَدَلَ۔ (گذشتہ اقوام میں سے اللہ تعالیٰ نے جس قوم کو ہلاک و برباد کیا تو اس کا سبب یہ تھا کہ وہ خدائی احکام کی باطل تفسیر کرنے لگتے، یوں ہی قرآن پاک کے واضح اور صاف بے غبار معنی کو اس لئے بدل دینا کہ یورپ والے اس مطلب کو پسند نہیں کرتے اسی کا نام معنوی تحریف ہے اس کا، مطلب تو یہ ہوا کہ خدا ناراض ہو جائے (العیاذ باللہ) کوئی حرج نہیں یورپی آقا ناراض نہ ہوں۔ شیطان اس معنوی تحریف پر اکساتا ہے اگر نسبت میں شبہ ڈالنے میں ناکام ہو جائے تو دوسرا ہتھیار تحریف ہے۔

شبہ فی الانتساب کی اقسام

شبہ فی الانتساب کے سلسلہ میں شیطان دو شبہے ڈالتا ہے۔ (۱) شبہ فی الثبوت (۲) شبہ فی الدلالت۔ ایک مسلمان کے لئے کتاب و سنت کے کسی حکم کا انکار مشکل ہوتا ہے اس لئے شیطان پہلے تو یہ شبہ ڈالتا ہے کہ یہ حکم شریعت سے ثابت نہیں ہے اسی کا نام شبہ فی الثبوت ہے۔ جیسے آج کل انکار حدیث کا فتنہ ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ چونکہ مسلمان ہوتے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم رسول کی بات نہیں مانتے اس لئے یوں کہا جاتا ہے کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے وہ سب مولویوں کی باتیں ہیں گویا چودہ سو سال کے طویل دور میں ہونے والی کاوشیں جو محدثین و فقہا نے کیں ہیں

وہ سب غلط اور ناقابل اعتبار ہیں۔ شیطانی شبہ فی النبوت کا دائرہ اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ آج کل نو تعلیم یافتہ افراد کی اکثریت اس سے متأثر ہے یوں ہی شبہ فی النبوت کی پیداوار نیچری فرقہ ہے جو معجزات کا انکار کرتے ہیں۔ (پرویز اور اس کا استاد مولوی اسلم جیراج پوری اسی گروپ کے سربراہ ہیں)

شبہ فی النبوت کا محرک

جب شیطان نے یہ سبق پڑھا دیا کہ جن چیزوں کا انکار کیا جاتا ہے شریعت میں ان کا ثبوت نہیں ہے تو پھر انکار کوئی جرم نہیں رہتا اس شبہے کا اصلی باعث و محرک بعد از تحقیق دو چیزیں معلوم ہوتی ہیں (۱) نفسانی خواہشات (۲) جاہ اور عزت کی خواہش۔ چونکہ فطرتاً انسان میں خواہش نفس اور خصوصاً عزت و جاہ کی چاہت موجود ہے اس لئے اغواء و اضلال کے فن کا امام شیطان زیادہ تر فطرت سے کام لیتا ہے۔ نتیجہ بایں جا رسید کہ نماز۔ زکواۃ۔ روزہ۔ حج۔ قربانی کا بھی مختلف طُرق سے انکار کیا جا رہا ہے مثلاً نماز کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عرب غیر مہذب اور بدّو تھے ان کو دن رات میں پانچ مرتبہ ہاتھ منہ دھونے کا حکم اس لئے دیا تھا تاکہ ان میں تہذیب پیدا ہو اور صفائی کے عادی بن جائیں اب چونکہ لوگ مہذب ہو چکے ہیں اس لئے اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ روزوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ عربوں کی حیوانی قوت بے لگام تھی ان پہ روزوں کا بوجھ ڈالا گیا تاکہ حیوانی طاقت دب جائے سوال یہ ہے اس طرح کی باتیں کیوں کہی گئیں؟ جواب واضح ہے کہ نماز اپنی پوری شرائط کیساتھ نفس کو سخت ناگوار ہے پھر چوبیس گھنٹوں میں پانچ بار تکرار یوں ہی طہارت ثوب، طہارت مکان۔ طہارت بدن وقت کی پابندی۔ جماعت کی پابندی پھر دنیا کے دیگر کاموں کی قربانی یہ سب چیزیں نفس کو ناگوار ہیں۔ مصطفیٰ کمال کے دور میں ترکی حکومت نے یہ قانون پاس کیا کہ کارخانوں میں کام کرنے والے پانچوں نمازیں ایک ہی وقت میں پڑھ لیا کریں تاکہ کارخانوں کی کارکردگی متاثر نہ ہو۔ یونہی حج کے متعلق کہا جاتا ہے کہ عربوں کو اس وقت ایک مرکزی تنظیم کی

ضرورت تھی اس لیئے حج کے نام سے ایک عبادت رکھی گئی اب بین الاقوامی تنظیموں کے قیام کے بعد اس کی ضرورت باقی نہ رہی اس لیئے حج کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

آج انہی بے ہنگم نفسانی خواہشات کا نتیجہ ہے کہ ہمارے مغرب زدہ مسلمان بھائی لندن جانے کے لیئے جدّے سے گذر جاتے ہیں لیکن حرمین شریفین کی حاضری حج یا عمرے کی صورت میں نصیب نہیں ہوتی یہ توفیق غریب اور متوسط طبقہ مولوی ٹائپ کے لوگوں کے لیئے ہے بالکل درست کہا گیا ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشند خدائے بخشندہ[1]

الغرض یہ دینی کام چونکہ نفس پہ ناگوار ہیں اور پھر شیطان یہ سبق پڑھاتا ہے کہ کام وہ کرنا چاہیئے جس میں فائدہ عاجلہ (فوری) ہو مولوی کی نماز روزہ حج کا کوئی ہاتھوں ہاتھ فائدہ نہیں ہوتا اس فوری منفعت کے احساس سے مذہبی امور میں شیطان انسان کو شک و شبہہ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اب تو یوں بھی سنا گیا ہے کہ جس کو کوئی کام نہ ہو وہ نماز پڑھے الغرض شبہہ فی النبوت کے لیئے نفسانی خواہش محرک اوّل ہے۔

دوسرا محرّک

شبہہ فی النبوت کے لیئے دوسرا محرک حبّ جاہ ہے۔ خنّاس نے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بٹھا دیا ہے کہ دینی باتوں کو اس طرح جو مانے اور عمل کرے وہ جاہل ہے۔ مقلد اور دقیانوس ہے اور جو تنقید کرے وہ محقق ہے اس کا نتیجہ ہے کہ لوگ دین کی باتوں کو ماننے اور عمل کرنے کے بجائے، تنقید شروع کر دیتے ہیں تاکہ ان کو محقق کہا جائے امام غزالی رحمہ اللہ نے تہافتہ الفلاسفہ میں لکھا ہے کہ معتزلہ نے بعض یقینی چیزوں کا انکار صرف اس لیئے کر دیا تاکہ ان کو محقّق کہا جائے ہمارے مولانا محمد ابراہیم صاحب (بلیاوی مرحوم سابق صدر مدرس دارالعلوم دیوبند) بطور تفنّن کے فرمایا کرتے تھے کہ آج کل محقق حُقّہ سے نکلا ہے جو بھی حُقّہ یا اس کا نائب

---

[1] یہ سعادت کسی کے زور بازو کا نتیجہ نہیں جب تک بخشنے والا خدا خود نہ عطا کر دے۔ (مرتب)

سگریٹ، چرس، بھنگ وغیرہ زیادہ پئے وہ محقق ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ محقق وہ ہوتا ہے جو ایک چیز کو ثابت کرنے والا اور اس کی تحقیق کرنے والا ہو آج کل کے مدعی تحقیق محقق تو نہیں ہاں مشکک ضرور ہیں یعنی ثابت شدہ چیزوں کے مقابلے میں اس طرح شیطانی دلائل لاتے ہیں جس سے سادہ دل مسلمانوں کے قلوب میں یقین کے بجائے شک پیدا ہو جائے۔

شبہ فی الدلالت

یعنی مطلب و مراد میں شبہہ پیدا کیا جائے شبہہ فی الثبوت کے بعد شبہہ فی الدلالت شیطان کا ایک اور ہتھیار ہے جب شیطان کے تمام ہتھیار ثبوت میں شبہہ ڈالنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو پھر دلالت میں شبہہ ڈالتا ہے کہ اس کا معنی اور مطلب یہ نہیں اور اس آیت یا حدیث کی یہ مراد نہیں ہے۔ آج کل شبہہ فی الثبوت کے بعد شبہہ فی الدلالت بہت زیادہ ہے چنانچہ اسی شبہہ سے قرآنی تحریفوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ دور حاضر کے مفسروں کی طبع نازک کے خلاف کتاب و سنت میں جو بات ہوتی ہے وہ اس کے معنی ہی بدل ڈالتے ہیں اس لئے جدید زمانے کی تفسیروں میں صحیح بہت کم ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ تبدیلی معنی تاویل نہیں بلکہ صریح انکار ہے۔ جو لوگ الفاظ قرآنی یا حدیثی کے معنی بدل ڈالتے ہیں ایسے لوگ مؤولین نہیں بلکہ منکرین قرآن و سنت کہلانے کے مستحق ہیں۔

معنوی تبدیلی کی ایک مثال

الفاظ کے معنی کو تبدیل کر دینے کی ایک مثال یوں سمجھئے مثلاً ایک آدمی کسی سے یہ کہتا ہے کہ گلاس میں پانی پلاؤ اور وہ جواباً تعمیل حکم میں گلاس لے اور اس میں پانی ڈالے اور پھر اس کا مجموعہ پانی مانگنے والے کے سر پر دے مارے اب اگر پانی مانگنے والا سوال کرے کہ تم نے یہ کیا کیا؟ مامور جواب میں کہے کہ جناب والا میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے لیکن میرے نزدیک آپ کے اس حکم کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں گلاس میں پانی ڈالوں اور پھر گلاس کو ہتھیلی پر رکھ کر آپ کے سامنے پیش کر دوں تاکہ آپ پانی پئیں میرے

نزدیک پانی پلاؤ کے معنی منہ کے ساتھ مختص نہیں ہیں بلکہ سارا بدن بھی پانی پی سکتا ہے اس لئے ہم نے پانی اور گلاس کا مجموعہ آپ کے بدن پر مار دیا ہے تاکہ آپ کا پورا بدن پانی پی لے۔ بتایئے ایسے شخص کو منکر حکم سمجھا جائے گا یا تعمیل کنندہ ؟

یہی حال قرآن و حدیث کے معانی بدلنے والوں کا ہے بلکہ الفاظ کا انکار اور معنی کا انکار ایک ہی چیز ہے کیونکہ الفاظ معنی کے لئے ہوتے ہیں جس نے معنی کا انکار کیا گویا اس نے الفاظ نہ مانے۔

شبہ فی المنتسب

(یعنی دینی احکام میں شبہ ڈال کر ایمان کمزور کرنا)

شیطان جو ایک ماہر دشمن ہے شبہ فی الانتساب کے بعد شبہہ فی المنتسب کی کاروائی کرتا ہے منتسب سے مراد دینی حکم ہے خواہ وہ قرآن پاک کی کوئی آیت ہو یا کوئی حدیث چنانچہ شیطان دین میں عقلیت۔ فطرت اور مادیت کے لحاظ سے اشتباہ پیدا کرتا ہے۔ اس کی مثال جہاد اسلامی ہے۔ قرآن پاک میں جہاد کے احکامات آئے ہیں۔ اسلام میں جہاد دفاعی بھی ہے اور ابتدائی بھی اور دونوں قسم کے جہاد جائز ہیں لیکن ہمارے مسلمانوں کا مغربیت زدہ طبقہ یوں کہہ دیتا ہے کہ اگر اسلام پر کوئی دوسری طاقت حملہ آور ہو تو مدافعت میں جہاد کیا جا سکتا ہے۔ مگر ابتدائے جہاد اسلام میں نہیں ہے۔ چونکہ یورپ کے اسلام دشمن طبقے کو اس پر اعتراض ہے۔ اس لئے ہمارے بعض پڑھے لکھے بھی ان سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ قرآن پاک میں صاف حکم ہے۔

یایھا الذین امنوا قاتلوا	اے ایمان والو اپنے قریب کے کافروں
الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا	سے قتال کرو اور وہ تم میں (جہاد کے ضمن میں)
فیکم غلظۃ (الایۃ)	سختی محسوس کریں)

ظاہر ہے اگر اس جہاد پر مسلسل عمل جاری ہوتا تو آج دنیا کا مذہب صرف اسلام ہوتا آج دنیا بھر کے مسلمان اسلام کے عظیم محسن حضرت فاروق

اعظمؓ عمر ابن الخطاب کی کمائی ہوئیں روٹیاں کھا رہے ہیں۔ جزاہ اللہ عنا وعن جمیع
الامۃ خیر الجزاء ۔ (اللہ تعالیٰ ہمارے سمیت ساری امت کی طرف
سے انہیں جزائے خیر عطا فرمائے آمین)

مغرب زدہ طبقہ کہتا ہے کہ یہ عقلیت کا دور ہے اگر ہم ابتدائی جہاد کے قائل ہو
جائیں تو یورپ اسلام کو خونریز مذہب سمجھے گا یونہی قتل مرتد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ چونکہ
قتل کا اصل جبر ہے اس سے عیسائیوں کو سند مل جائے گی کہ مسلمانوں کا دین زور سے پھیلا
ہے۔ ایک عرصہ قبل کی بات ہے کہ جب قادیانیوں کو افغانستان میں ارتداد کے جرم میں قتل کیا
گیا تو ہندوستان بھر میں بہت شور برپا ہوا اخبارات و رسائل میں اس کے حق میں اور اس کے
خلاف مضامین لکھے گئے۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے اپنے اخبار زمیندار میں علماء کی طرف
سے بیس مضامین قتل مرتد کے بارے میں چھاپے۔ اس سلسلے میں ایک نادر تصنیف شیخ
الاسلام حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا رسالہ ہے۔ جس کا نام الشہاب
لرجم الخاطف المرتاب ہے۔ یہ اس موضوع پر قابل دید رسالہ ہے[لہ]

قوانین کی معقولیت ماہرین ہی جانتے ہیں

یہ شیطانی شبہہ کہ فلاں قانون عقل کے خلاف ہے
لہٰذا غلط ہے تو اس کا ایک اجمالی جواب یہ ہے کہ ہر ملک میں ایک قانون ہوتا ہے مثال
کے طور پر یہاں تعزیرات پاکستان یا ضابطہ دیوانی وغیرہ ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ضابطہ یا
تعزیرات ریلوے کے ایک قلی تانگے کے کوچوان یا گھسیارے کی سمجھ میں آسکتے ہیں؟
حقیقت یہ ہے کہ قانونی باریکیاں عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ تقریباً ہر ملک کا یہی حال
ہے بلکہ جہاں تعلیم کا معیار بہت بلند ہے وہاں بھی قانون ہر شخص نہیں سمجھ سکتا تو معلوم ہوا

لہ قیام پاکستان کی تقریب پر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میں پاکستانی جھنڈا لہرانے والی شخصیت حضرت
شیخ الاسلام کا یہ یہاں رسالہ ضبط رہا ہے فیا للعجب؟ (علی اصغر)

کہ یہ ایک بین الاقوامی قاعدہ ہے کہ قوانین کی معقولیت ماہرین فن ہی جانتے ہیں عام لوگ نہیں جانتے اگر عوام بھی جانتے ہوتے تو آجکل عدالتوں میں مقدمات کی پیروی کے لئے وکلاء کو بڑی بڑی رقمیں نہ دی جاتیں تو عوام کا نہ جاننا قانون کے غلط ہونے کی دلیل نہیں ہے ورنہ یہ کہنا پڑے گا. کہ دنیا میں قانون کبھی آیا ہی نہیں اور یہ حقیقت کے خلاف ہے۔

جب انسانی قانون کا یہ حال ہے کہ انسانوں جیسے ایک انسان کا بنایا ہوا قانون عام انسان نہیں سمجھ سکتے بلکہ خواص ہی سمجھتے ہیں تو پھر اللہ کا قانون جس کا علم بہت ہی وسیع اور بلند ہے ہر کوئی کیسے جان سکتا ہے؟ خدائی قوانین کی مراد بتانا ماہرین اسلام ہی کا کام ہے۔ اگر خواص ہی کا جاننا ضروری ہے تو اس امت کے خواص ماہرین اسلام علماء کرام ہیں یہ طبقہ جہاد اسلامی اور قتل مرتد کے قانون کی معقولیت کو جانتا ہے۔

اس کا خصوصی جواب یہ ہے کہ جہاد یا قتل مرتد پر اس لئے اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کو خلاف عقل سمجھتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاد اسلام پھیلانے کے لئے پوری کوشش اور جدوجہد کا نام ہے جس کا مقصد اسلام کو غالب رکھنا ہوتا ہے اسلام کی سربلندی کی کوشش کبھی زبان سے کبھی قلم سے اور کبھی تلوار سے ہوتی ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی کوشش کو معقول یا نامعقول کہنا اس امر کا متقاضی ہے کہ دیکھا جائے وہ مقصد جس کے لئے یہ کوشش کی جاری ہے معقول ہے یا غیر معقول؟ جہاد کا مقصد اسلام کی سربلندی ہے اور اسلام بدن و روح کی صحت کا ضامن ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس چیز سے صحت اجسام ہو اس میں صرف جدوجہد ہی نہیں بلکہ جبر بھی کام آتا ہے مثال کے طور پر کسی آدمی کے ایک عضو پر زہریلا پھوڑا ہے. اور اس بات کا امکان ہے کہ اس کا زہر تمام بدن میں سرایت کر جائے گا تو ڈاکٹر آپریشن تجویز کرتا ہے اگر مریض کہے کہ چونکہ آپریشن میں تکلیف و درد ہے اس لئے میں آپریشن نہیں کرواؤں گا اور ڈاکٹر مریض پر جبر کرتے ہوئے مریض کو آپریشن روم میں لیجا کر اس کا آپریشن کر دے اور فاسد مادہ اس کے جسم سے نکال دے۔ جب لوگوں کو یہ حقیقت معلوم ہو گی کہ مریض کے سا

چاہنے کے باوجود ڈاکٹر نے جبراً آپریشن کیا ہے تو لوگ کہیں گے خدا ڈاکٹر کا بھلا کرے کہ اس نے مریض کا آپریشن کرکے زہریلا مادہ نکالدیا اور یُوں اس کی جان بچ گئی بلکہ آج کل تو منت سماجت کے ساتھ فیس بھی دی جاتی ہے تو یہ آپریشن کی کاروائی جبر وقہر کے تحت نہیں بلکہ شفقت ورحمت کا تقاضا ہے۔ اسی طرح جہاد اسلامی کے ذریعہ کفر کے فسد مادے کا آپریشن کیا جاتا ہے۔

جہاد رُوحانی آپریشن ہے

یونہی جہاد ایک روحانی آپریشن ہے جو اثرات قہر میں سے نہیں بلکہ رحمت وشفقت کے اثرات میں سے ہے۔ جہاد ابتدائی ہو یا دفاعی دونوں ہی جہاد ہیں۔ صرف دفاعی جہاد ماننا تو بچوں کا مذاق ہوا کہ تم میرا آپریشن کرو تو میں تمہارا آپریشن بھی کروں گا۔ یہ دفاعی ہے۔ جبکہ ابتدائی جہاد یہ ہے کہ تم میرا کرو یا نہ کرو میں ہر حال میں تمہارا آپریشن کروں گا۔ خدا عقل سلیم عطا فرمائے

قتل مرتد جبر نہیں

یوں ہی قتل مرتد بھی جبر نہیں اس لئے کہ اسلام کا سیاسی تصور یہ ہے کہ حاکمیت اعلیٰ صرف اللہ رب العالمین کی ہے کتاب وسنت اللہ کا قانون ہے مسلمان اپنے آپ کو اللہ کی رعیت تسلیم کریں یہ بات بھی سمجھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکومت دو قسم کی ہے ایک تکوینی جو عالمگیر ہے۔ مثلاً، کسی کو مارنا کسی کو پیدا کرنا یونہی اس جہان میں جس قدر انقلابات رونما ہوئے ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکومت کے مظاہرے ہیں دوسری حکومت تشریعی ہے اس کا دائرہ، مومنین تک محدود ہے جبکہ تکوینی حکومت میں کافر اور مومن دونوں یکساں محکوم ہیں لیکن اللہ کی تشریعی حکومت کے تحت صرف مومن رعیت میں شامل ہے اب اگر ایک مومن اللہ کی رعیت میں ہونے کے باوجود ارتداد اختیار کرے جو کہ خدائی حکومت کی بغاوت ہے تو اس کے نتیجے میں باغی کو قتل کر دینا ایک بین الاقوامی (حکومتوں کے) قانون کے مطابق ہوگا۔ قتل

مرتد جبرا اس وقت ہوتا جب کسی کو مسلمان بنانے کے لئے طاقت استعمال کی جاتی لیکن ایک آدمی جب اپنی خوشی سے دائرہ اسلام میں داخل ہو کر اللہ تعالیٰ کی رعیت کا ایک رکن بن گیا ہو تو اب دین اسلام کو چھوڑ دینا اللہ کی حکومت کی توہین کے مترادف ہے جس کی اجازت کسی حکومت میں نہیں ہو سکتی کافر چونکہ تشریعی حیثیت سے اللہ کی قانونی رعیت میں داخل نہیں س لئے اسے قتل نہیں کیا جاتا جبکہ وہ اسلامی حکومت کا ایک وفادار شہری بن کر زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے (کفر اور ارتداد میں یہ فرق ہوا، ارتداد بغاوت ہے جبکہ کفر ایسا نہیں)

شبہ فی المنتسب کا حاصل چار امور ہیں

(۱) تغریر بالدنیا (دنیا کے ذریعہ دھوکہ) (۲) تغریر بصفات اللہ تعالیٰ، (اللہ تعالیٰ کی صفات سے دھوکہ) (۳) تغریر بتسکین الشہوات (چاہت کی تسکین سے دھوکہ) (۴) تغریر بتسکین الغضب غصّہ کے تسکین کے ذریعہ دھوکہ)

قرآن وحدیث میں جہاں کہیں بھی شیطان کا تذکرہ آیا ہے وہ انہی چار اصولوں کے تحت آیا ہے کہ وہ ان ہتھیاروں سے اغوا و اضلال کا کام کرتا ہے۔

تغریر بالدنیا:۔ کے ضمن میں شیطان کی کارروائی کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک آدمی سرمایہ دار ہو جس کے گھر میں اگر روپیہ پڑا رہے تو اس میں دولت کے اضافے کے بجائے ادائیگی زکواۃ اور دیگر مصارف کی وجہ سے کمی ہوگی لیکن یہی رقم اگر سودی کاروبار میں لگادی جائے تو نفع ہوتا ہے شیطان ایسے سرمایہ دار کو یہ سبق پڑھاتا ہے کہ سود کا لین دین اگرچہ شرعاً گناہ ہے لیکن دنیاوی نفع کے پیش نظر اس گناہ کو برداشت کر لیا جائے ورنہ دولت میں نقصان کا خطرہ ہے یا یوں سمجھئے کہ رشوت نہ لینا ایک نیکی ہے اور رشوت کا لین دین ایک گناہ کبیرہ ہے۔ اب شیطان یہ سبق پڑھاتا ہے کہ رشوت لینے کی صورت میں دنیاوی فائدہ ہے جبکہ نہ لینے کی صورت میں یہ

فائدہ حاصل نہ ہوگا یونہی اگر کسی نے ظالمانہ طور پر کسی کی زمین جائیداد پر قبضہ کیا ہوا ہے تو شیطانی سوچ کے مطابق وہ اسے مالی فائدہ سمجھتا ہے اور اگر انصاف کرتے ہوئے زمین یا کوئی چیز اصل مالک کو واپس کر دی جائے تو شیطانی سبق کے مطابق اس کے ہاتھ سے دولت نکل جائے گی آج کل کی یورپی تہذیب کا قاعدہ یہ ہے کہ شخصیت کی تعمیر ہو یعنی ہر شخص اپنی ذات کو مضبوط بنائے گویا اُسے ذاتیت اور انفرادیت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یورپین سوچ یہ ہے کہ صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ ذات کا فائدہ ہے یا نقصان؟ جبکہ اسلام کی نظر مصلحت عامہ پر ہے آج کل یورپی تہذیب کے نتیجے میں مصلحت عامہ کا جذبہ ختم ہوتا جا رہا ہے اور مصلحت ذات کے جذبے کو پروان چڑھایا جا رہا ہے۔ گویا ملت کے اجتماعی مفاصد ختم ہو رہے ہیں اور ذاتی اور انفرادی جذبات کو فروغ مل رہا ہے۔ جبکہ حضرات انبیائے علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم اس نظریے کے صریحاً خلاف ہے چنانچہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے قرآنی تعلیم و تہذیب کے ذریعے جن لوگوں کی تربیت فرمائی تھی ان کے متعلق قرآن پاک میں ایک جگہ ارشاد خداوندی یوں ہے۔ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (اور یہ مسلمان اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ ان کو شدید ضرورت ہی کیوں نہ ہو) جس کا مطلب صاف ہے کہ ان لوگوں میں ایثار کی صفت ہو۔ گویا صحابہ کرامؓ کے متعلق یوں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ عوامی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں چاہے خود بھوکے ہی ہوں یہ حقیقت ہے کہ بھوک کی حالت میں ایثار کرنا آسان نہیں ہے۔

ایک یورپی مؤرخ مسٹر آرنلڈ پریچنگ آف اسلام میں لکھتے ہیں کہ ایثار کا لفظ ہر قوم میں محبوب اور مقبول ہے لیکن بجز والبستگان مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. اس پر کسی کا عمل نہیں ہے خَصَاصَةٌ کے معنی بھوک کے ہیں لیکن ایک عام اور معمولی بھوک ہوتی ہے جس کو عربی میں جوع کہتے ہیں جبکہ خَصَاصَةٌ۔ انتہائی شدت کی بھوک کا نام ہے اسلامی تاریخ میں ایثار کی مثالیں تو بہت ہیں لیکن ایک واقعہ اسلامی تاریخ کا عجیب

وغریب ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ زخموں سے چور چور ہیں اور میدانِ جنگ میں پیاس کی وجہ سے تڑپ رہے ہیں۔

نزع سے قبل پانی لایا جاتا ہے مگر دوسرے زخمی کی آواز سن کر پانی اس تک پہنچانے کا اشارہ کر دیتے ہیں۔ دوسرا زخمی بھی تیسرے کی آواز سن کر پانی پہنچانے کا اشارہ تیسرے کی طرف کر دیتا ہے اور پھر تیسرا چوتھے کی طرف مگر چوتھا زخمی اس وقت تک مرجاتا ہے پھر پانی تیسرے کے پاس لایا جاتا ہے مگر وہ بھی جان بحق ہو چکا ہوتا ہے اور یونہی پہلے صحابی رضی اللہ عنہ تک جب پانی پہنچایا جاتا ہے تو وہ بھی اس جہان سے رخصت ہو چکے ہوتے ہیں۔

یہ واقعہ اسلامی تاریخ کا سنہری شاہکار ہے ایثار کی ایسی نظیر کہاں مل سکتی ہے۔؟

مسٹر آرنلڈ تو ایک انصاف پسند مورخ ہے۔ لیکن عموماً یورپی تہذیب اور ان کا انداز زندگی ان کی تعلیم و تربیت تمام تر انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا توڑ ہے گویا یورپی تہذیب میں ابلیس، خواہشات کی تکمیل ہے جبکہ انبیاء کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ شخصیت کو ملی مفاد پر قربان کر دیا جائے۔ لیکن شیطان کی کاروائی اس کے مقابلے میں یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی محبت کو بار بار ذہن میں راسخ اور پختہ کرنے کا سبق پڑھاتا ہے قرآن پاک میں ارشاد ہے

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ۔ الایۃ (انسانوں کے لئے خواہشات کی محبت کو مزین کر دیا گیا ہے) مثلاً عورتیں اولاد اور بہت سی دولت جو سونے چاندی اور چرنے والے گھوڑوں اور چوپائیوں کی شکل میں ہیں) واقعی شیطان نے اس کے مطابق ہی یورپی شیطانوں کو یہ سبق پڑھایا ہے کہ مخلوط تعلیم اور بے پردگی کے ذریعے اور یونہی آزادی نسواں کے عنواں سے اس فتنے کو پھیلانے کی کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی یونہی حبِ اولاد بھی انسان کو خلاف شرع امور کے ارتکاب کے لئے دیوانہ بنا دیتی ہے، یہی حال قرآن پاک کی بتائی ہوئی فہرست کی دوسری اشیاء کا ہے یہ تمام اشیاء قرآنی فرمان کے مطابق اس فانی زندگی کا ایک معمولی ساز و سامان ہے۔ جبکہ شیطان ان چیزوں کی محبوبیت کا نقشہ ذہن میں جما کر انسانوں کو انبیاء علیہم السلام الصلواۃ

کے راستے سے ہٹانے کی سازش کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خواہشات کا غلام بن کر احکام خداوندی کی حدود پھلانگ جاتا ہے۔

خواہشات کے شیطانی حملے کا دفاع

اس شیطانی حملے کا ڈیفنس قرآن پاک نے غضِ بصر کا حکم دیکر کیا ہے اس حکم کو مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے عام رکھا گیا ہے مزید براں عورتوں کو حجاب کا خصوصی حکم بھی اسی لئے دیا ہے یورپی تہذیب و تعلیم نے حب الشہوات من النساء آزادی نسواں کے عنوان پر انسانوں کی اکثریت کو گمراہ کر دیا ہے اس ضمن میں ماں کی گود (جو تربیت کا پہلا مدرسہ ہوتا ہے) بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے دینی تعلیم نہ ہونے کی بنا پر نسلِ انسانی کا بگاڑ انتہا کو پہنچ گیا ہے۔

ایک لطیفہ

نکاح کا ایک خواہش مند نوجوان میرے پاس مشورہ کے لئے آیا اور کہا کہ دو رشتے ملتے ہیں ایک تو تعلیم یافتہ ہے جبکہ دوسری جاہلہ ہے کس کا انتخاب کیا جائے؟ میں نے کہا کہ جاہلہ سے شادی کر لو اس نے ایسا ہی کیا اور کامیاب زندگی گذار رہا اس کے دوستوں نے اعتراض کیا کہ جاہلہ کو تعلیم یافتہ پر ترجیح دینے کی کیا وجہ ہے؟ میں نے جواباً کہا کہ میرا استدلال قرآن پاک سے ہے ایک مقام پر عورتوں کی تعریف کرتے ہوئے ان کی ایک صفت الغافلات (بھولی بھالی) آئی ہے اور یہ صفت مؤمنات کی صفت سے بھی مقدم بیان فرمائی ہے غافلات کا معنی بھولی بھالی جو گھر کے علاوہ باہر دنیا کی باتوں سے بے خبر ہو گویا یہ صفت عورت کے لئے ایمان کی طرح ایک اہم ترین صفت ہے دینی تعلیم تو فرض ہے یہ انکار دورِ حاضر میں بے دینی پیدا کرنے والی تعلیم سے متعلق ہے چنانچہ تو تعلیم یافتہ بچیاں آج کل دنیا بھر کی خبریں دیتی رہتی ہیں ہاں گھر کی ضرورتوں سے بے خبر ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ آج کل اکثر شادیاں ناکام ہوتی ہیں۔ اسلئے جدید سے مراد جدید تعلیم کے منفی اثرات سے بے خبر ہے۔ آج کل دینی تعلیم والوں کو جاہل ہی

سمجھا جاتا ہے۔ یہ یورپی تہذیب کا اثر ہے۔

نقد ادھار سے بہتر ہونے کی شیطانی منطق

شیطان جہاں مرغوباتِ نفس کو خوشنما بناتا ہے وہاں ان مرغوبات کے اوصاف کی خوشنمائی میں بھی پوری کوشش کرتا ہے جیساکہ امام غزالی رح نے ذمّ الغرور کے باب میں بیان کیا ہے کہ شیطان منطقیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے یہ سبق پڑھاتا ہے کہ دنیا کے فوائد ہاتھوں ہاتھ اور نقد ہیں جبکہ آخرت کے فوائد ادھار ہیں اور نقد ادھار سے بہتر ہوتا ہے۔ عربی الفاظ میں منطقی قیاس یوں ہوگا

الدُّنیا نَقدٌ والآخرۃ نَسِیئۃٌ دنیا نقد ہے اور آخرت ادھار ہے
وَالنَّقدُ خیرٌ مِنَ النَّسِیئۃ۔ اور نقد ادھار سے بہتر ہے۔

شیطانی قیاس کا صغریٰ درست ہے جبکہ کبریٰ ٹھیک نہیں کیونکہ نسیہ اگر کثیر ہو اور نقد قلیل ہو تو خیریت کا معاملہ برعکس ہو جائے گا مطلب یہ ہوا کہ ہر نقد ادھار سے بہتر نہیں اگر نقد قلیل اور ادھار کثیر ہو تو ادھار ہی بہتر ہوتا ہے جیساکہ سودی (الزامی مثال) کاروبار کرنے والے رقم نقد دیتے ہیں اور نفع ادھار ہوتا ہے یہ مریدینِ ابلیس خود ابلیسی منطق کے خلاف کاروبار کرتے ہیں یا یوں سمجھیں کہ مثال کے (جائز مثال) طور پر ایک ایکڑ زمین میں بارہ سیر گندم کا بیج کاشت کیا جاتا ہے اب بیج کا مٹی میں ڈالنا ایک نقد معاملہ ہے اور غلّہ جو آٹھ ماہ بعد زمین سے برآمد ہوتا ہے ادھار ہے اگر ابلیسی منطق کے مطابق "نقد ادھار سے بہتر ہے گندم کاشت ہی نہ کرے تو لوگ اس کو احمق اور کاشت کرنے والے کو عاقل تصور کریں گے معلوم ہوا کہ شیطانی منطق کے قیاس کا کبریٰ (دوسرا جملہ) غلط بھی ہے اور کلیہ بھی نہیں اور قرآنِ پاک نے ایک موقعہ پہ نقد ادھار سے بہتر ہے کی تردید یوں فرمائی ہے۔

بَل تُؤثِرُونَ الحَیٰوۃَ الدُّنیا وَالآخِرَۃُ خَیرٌ وَّ اَبقیٰ ۔ نہیں تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو جبکہ آخرت بہتر بھی ہے اور اس کو بقا بھی ہے

مطلب صاف یہ ہے کہ تم فوائد دنیا کو ترجیح دیتے ہو جو نقد قلیل ہے اور آخرت کے فوائد جو کماً کیفاً ہر حالت میں بہتر ہیں ان کو ترک کرتے ہو ایک جگہ اور زیادہ واضح الفاظ میں ارشاد ہے۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ۔ (تم جلدی کی چیز چاہتے ہو اور آخرت چھوڑتے ہو)

الغرض شیطان نقد اور ادھار کی منطق چلا کر لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے اسی کا نام تغریر بالدنیا ہے جس کو تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے اور قرآنی آیات سے اس شیطانی منطق کا جواب بھی آگیا ہے۔

تغریر بصفاتِ اللہ تعالےٰ

قرآن پاک کی ایک آیت میں تغریر بالدنیا اور تغریر بصفات اللہ تعالیٰ دونوں کو بیان (دنیا کے ذریعہ دھوکا اور اللہ تعالیٰ کی صفات سے دھوکہ) کر دیا گیا ہے ارشاد ہے۔

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔ (سو تم کو دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے اور بڑا دھوکے باز شیطان تم کو اللہ کی صفات سے دھوکہ نہ ڈالے۔

شیطان اولادِ آدم کو اللہ تعالےٰ کی صفات سے بھی دھوکہ دیتا ہے مثلاً کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو غفور رحیم ہے بخش دے گا یعنی صفاتِ خداوندی کو ارتکابِ معصیت اور ترک طاعت کے لئے آڑ بناتا ہے آج کل کے تو تعلیم یافتہ کہا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ گناہ پر اگر بندوں کو سزا دے تو اس کو کیا فائدہ ہے ؟ دوسرے لفظوں میں شیطان مجازاتِ اعمال کے قرآنی عقیدے کے یقین کو شک میں تبدیل کرتا ہے اور یہ دھوکہ بازِ ابلیس کا کارآمد جال ہے۔

اللہ کی صفات جلال وجمال کا تناسب

ابلیس کا دھوکہ ارباب عقل کے سامنے اس لئے نہیں چل سکتا کہ قرآن پاک میں جہاں اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا بیان ہے اس کے ساتھ ہی جلال خداوندی کو بھی رکھا گیا ہے۔ تاکہ مجازاتِ اعمال کا قانون بندے کے سامنے رہے۔

چنانچہ سورۃ فاتحہ میں ہی جو ہر نماز میں پڑھی جاتی ہے اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے ساتھ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن کو بھی لایا گیا ہے جس میں بتانا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات جہاں رحمت کی صفت سے متصف ہے وہاں روزِ جزا کا مالک بھی ہے لیکن خدا کا قہر اور جلال حجاج ابن یوسف کی طرح بے قاعدہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کا رحم نوشیرواں کی طرح بے ضابطہ ہوتا ہے بلکہ خدائی جلال و جمال. قہر و رحم دونوں ضابطے کے تحت ہیں قرآن پاک میں جہاں اہل طاعت پر انعام کا ذکر ہے وہ رحمت کا ظہور ہے اور اہل معصیت کے لئے جہاں سزا کا ذکر ہے وہ اس کی عدالت اور انصاف پسندی کا ظہور ہے. الغرض شیطانی دھوکے کا جواب قرآنِ پاک میں دیدیا گیا ہے یعنی بے شک وہ رحیم ہے لیکن رحمت کا استحقاق اربابِ طاعات ہی رکھتے ہیں نہ کہ اربابِ معصیت اس لئے تغریر بصفات اللہ (صفاتِ جمال سے دھوکہ) عقلمندوں کو نہیں دیا جا سکتا. بشرطیکہ صرف نام کے عقلمند نہ ہوں جیسا کہ آج کل قرآنی علوم سے بے خبر طبقہ بھی دانش ور کہلاتا ہے کبیرا داس نے اسی کا نقشہ کھینچا ہے.

رنگی کو نارنگی کہیں بنے دودھ کو کھویا ؛ چلتی کا نام گاڑی رکھیں دیکھ کبیرا رویا

تغریر تسکین الشہوات

یعنی تیسرا دھوکہ شیطان کی طرف سے اولادِ آدم کو یوں دیا جاتا ہے کہ اپنی چاہت کے مطابق عمل کرنے سے زندگی پرسکون ہوتی ہے مثال کے طور پر وقتی لذت حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے زانی کو زنا، کی شرابی کو شراب کی حرام خور کو حرام مال کی یہ لذتیں تسکین الشہوات کی صورتیں ہیں کہ چاہتوں کو پورا کرنے سے سکون ہوتا ہے اس شیطانی دھوکہ کا جواب یہ ہے کہ دشمنِ خدا الذات کے حصول کی ترغیب تو دیتا ہے مگر اولادِ آدم کو دنیا کی چند روزہ لذتوں کے نتیجہ میں آخرت میں جو تکالیف اور آلام برداشت کرنی ہوں گی. وہ نہیں بتاتا اگر ان مصائب کا پتہ بھی چل جاتا تو پھر تقابل کی صورت میں یہ حقیقت سامنے آجاتی کہ آخرت کی معمولی سی، تکلیف بھی دنیا کی لذاتِ کثیرہ کے مقابلے میں بہت زیادہ اور ناقابل برداشت ہوگی یہ جواب

رآن پاک میں ہے

یَوْمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَهٗ اَحَدٌ - پھر اس دن اس جیسا عذاب کوئی نہیں دے گا۔
ں شیطان آخرت کی سزا یاد نہیں دلاتا مثال کے طور پر اگر کسی سے کہا جائے کہ ایک نوالہ حرام کا کھا
لیکن اس کی سزا کے طور پر ایک گھنٹہ تک آگ میں ہاتھ رکھنا ہوگا یا کہا جائے کہ ایک گلاس
راب کے بدلے میں آگ کی چنگاریوں کا بھرا ہوا گلاس بھی منہ میں انڈیلنا ہوگا تو یقینی بات
کہ اس فوری لذت کو حاصل کرنے کے لئے کوئی عقلمند اتنی بڑی مصیبت قبول کرنے کو
ر ہوگا۔ من مانی کرنے والے کو سزا بھی تو شدید دی جائے گی۔

غریر تسکین الغضب

یعنی شیطان گناہوں کا ، ارتکاب یوں بھی کراتا ہے

ی ناراضگی کی فطری چاہت کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن یہ نہ دیکھے کہ غضب کے اظہار کا موقعہ
ں ہے یا نہ ؟ بس جب بھی غصہ آئے تو اس کے اظہار ہی سے سکون پائے یہ شیطانی دھوکہ
اس کا نتیجہ دین و دنیا کے لئے خطرناک ہوتا ہے اسی لئے قرآنِ پاک میں مسلمانوں کی تعریف
ے ہوئے ایک مقام پر ارشاد ہے کہ مسلمان تو غصہ پی جانے والے ہوتے ہیں اور حدیث شریف
غصہ کے وقت اپنے آپ کنٹرول کرنے والے کو پہلوان قرار دیا گیا ہے لیکن قرآنی حدیثی
م پر عمل نہ کرنے والے اس شیطانی دھوکے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ر تاثیر

یعنی اللہ تعالیٰ نے شیطان سے بچاؤ کے لئے مسلمانوں کو یہ نسخہ بنایا ہے کہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھ لیا
س ایک جملہ سے شیطان کیسے شکست کھا جاتا ہے اور اس کی عقلی توجیہہ کیا ہے ؟
مخالفین اسلام نے استعاذہ کے بارے میں یہ اعتراض کیا ہے کہ قرآن پاک نے ایک طرف

غرض اولادِ آدم کو گمراہ کرنے کے لئے شیطان جو تدابیر اختیار کرتا ہے ان کا ذکر ستر تدبیر کے عنوان کے
ت کر دیا گیا ہے۔ (علی اصغر)

تو شیطان کو عدوٌ مبین قرار دیا ہے جبکہ دفاعی تدبیر صرف یہ بتائی ہے کہ اعوذ باللہ پڑھ لیا کرو. یہ خلاف عقل ہے (اس کے جوابات ذیل میں ملاحظہ ہوں.

تعوّذ مؤثّر بالخاصہ ہے

پہلا جواب تو یہ ہے جیسا کہ بہت سے مفسرین حضرات نے بیان کیا ہے کہ تعوّذ شیطانی اضرار سے بچاؤ کے لئے مؤثر بالخاصہ ہے یعنی اس جملے میں خدا نے تاثیر رکھی ہے کہ شیطانی حملوں سے بچاؤ ہو جاتا ہے جس طرح بعض دوائیں مؤثر بالخاصہ ہوتی ہیں. جیسا کہ کونین ملیریا کے لئے مؤثر بالخاصہ ہے یعنی کونین کی ماہیت میں خدا نے یہ خاصیت رکھ دی ہے کہ اس سے بخار جاتا رہتا ہے اگرچہ اس کی کوئی عقلی وجہ نہیں ہے اس لئے کہ ملیریا بخار موسم خزاں میں ہوتا ہے اور عموماً اس کا سبب گرمی اور خشکی ہوتی ہے. جبکہ کونین خود بھی گرم اور خشک ہے الغرض طبّی حیثیت سے بخار کے جانے کی کوئی معقول توجیہہ نہیں ہے مگر تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہے کہ کونین سے ملیریا بخار رفع ہو جاتا ہے اسی طرح اعوذ باللہ سے شیطان کو دفع کرنے کی اگر کوئی معقول وجہ نہ ہو تو یوں کہا جائے گا کہ اعوذ باللہ کا جملہ دفع شیطان کے لئے مؤثر بالخاصہ ہے یعنی حکیم مطلق نے اس جملے میں یہ خاصیت رکھدی ہے کہ یہ جملہ پڑھتے ہی شیطان بھاگ جاتا ہے.

معقول توجیہہ

علاوہ ازیں اعوذ باللہ کے جملے سے شیطان کو دفع کرنے کی ایک معقول توجیہہ بھی ہو سکتی ہے. وہ یہ ہے کہ ایک انسان جب اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھتا ہے تو شیطان کو درج ذیل تین معلومات ہوتی ہیں

۱ - اللہ تعالیٰ کی ذات مستعاذ بہ ہے یعنی جس کے دربار میں شیطان کی شرارتوں سے بھاگ کر پناہ لی جا رہی ہے وہ اللہ کی ذات ہے. اور وہ مجھ سے زیادہ طاقتور ہے.

۲ - شیطان مستعاذ منہ ہے یعنی شیطان کی شرارتوں سے پناہ لی جا رہی ہے.[۱]

۳ - اعوذ باللہ پڑھنے والا مستعیذ یعنی ایک مومن پناہ مانگ رہا ہے جس کو اس کے خدا نے

---

[۱] ، جب خدا کو امداد کے لئے بندہ پکارتا ہے تو خدا مدد کو آتا بھی ہے یہ دوسرا علم ہے.

یہ تدبیر بتائی ہے۔

شیطان اس حقیقت کو جانتا ہے کہ اللہ کی ذات قوی ہے اور میں کمزور ہوں وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایک ایماندار نے اللہ کی قوی ذات سے میرے خلاف فریاد کی ہے علاوہ ازیں شیطان کو معلوم ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہیں اس لیئے جس فریادی نے اعوذ باللہ کے ذریعے فریاد کی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی پکار ضرور سنی ہو گی پھر یہ بھی شیطان خوب جانتا ہے کہ اعوذ باللہ پڑھنے کی تدبیر بندے کو میرے خلاف خدا نے خود سکھائی ہے

اور جو تدبیر خدا خود بتاتا ہے اسے کامیاب بھی فرما دیتا ہے۔ اسلئے اس تدبیر کو خدا ضرور مؤثر بنائے گا ان معلومات کے بعد جب ایک بندہ نعوذ پڑھتا ہے تو شیطان ایک لمحہ ٹھہرے بغیر بھاگ جاتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اس فریادی کی فریاد پہ خدا ضرور امداد فرمائے گا۔

ایک محسوس مثال

اس کی ایک عام فہم محسوس مثال یوں سمجھیئے کہ ایک محلے میں دو بچے آپس میں لڑ پڑتے ہیں ان میں سے ایک بچہ آٹھ سال کی عمر کا ہے جبکہ دوسرا چار سال کا ہے یقینی بات ہے کہ آٹھ سال والا بچہ چار سال والے بچے کو مارے گا۔ کیونکہ وہ طاقتور ہے اور یہ چھوٹا ہے لیکن اگر اسی وقت چار سالہ بچہ روتے ہوئے یوں فریاد کرے ابا جان یا امی جان پہنچو مجھے یہ مار رہا ہے پھر اگر ابا جان کی طرف سے یا امی جان کی طرف سے یہ آواز آئے کہ میں آیا تو یہ آواز سنتے ہی آٹھ سالہ بچہ بھاگ کھڑا ہو گا کیونکہ اس بڑے بچے کو بھی شیطان والی تینوں معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس بچے کو یہ تو اندازہ ہے کہ اس چھوٹے بچے کو میں مار سکتا ہوں لیکن اگر چھوٹے بچے کی امی یا ابا آ گئے تو میرے لیئے مقابلہ نا ممکن ہو جائے گا۔

علاوہ ازیں اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ کا جملہ چند ایسے تصورات دیتا ہے جو ایک مومن کے لیئے حفاظتی قلعے کی حیثیت رکھتے ہیں ایک تصور یہ ہے کہ یہ جملہ ۔۔۔۔ ایک ذکر

ہے اعوذ باللہ کا ترجمہ یہ ہے کہ میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں شیطان مردود سے لفظ اللہ ذکر ہے
جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا، حدیث قدسی میں ہے:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ ۔	جب بندہ اپنے دل میں یاد کرتا ہے میں بھی
اذا ذکر العبد فی نفسہ	اس کو اپنے دل میں یاد رکھتا ہوں اور جب بندہ
ذکرتہ فی نفسی واذا ذکرنی	مجھے کسی مجمع میں یاد کرتا ہے تو میں اس کو اس سے
فی ملاء اذکرہ فی	بہتر مجمع میں یاد کرتا ہوں۔
ملاء خیر منہم:	

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ کے یاد کرنے سے مراد محض زبانی تکرار نہیں بلکہ یہ ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ ہمارے جاننے والوں میں سے جب کوئی آدمی بیت اللہ شریف کے سفر پر جاتا ہے۔ تو ایسا کہتے ہیں کہ بھائی ہمیں یاد کرنا اس یاد کرنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ان کا نام لے کر تسبیح پڑھنی شروع کر دی جائے بلکہ دعا بالخیر سے یاد کرنا مراد ہوتا ہے یعنی نفع پہنچانا یونہی اللہ کے یاد کرنے کا مطلب جب نفع پہنچانا ہوا۔ تو یہ فرمان کہ میں تمہیں یاد کروں گا کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہیں فائدہ پہنچاؤں گا اور تمہاری تکلیف درد مصیبت کو دور کروں گا۔ یونہی جب ایک بندہ اعوذ باللہ کے ذریعے خدا کو یاد کرتا ہے تو خدا اپنے بندے کو نفع پہنچانے کی شکل میں یاد فرماتا ہے اور پھر خدائی امداد انسانوں کی طرح نہیں ہوتی جیسے ملک کے صدر نے اگر کسی کی تکلیف دور کرنی ہوتی ہے تو پہلے دار الحکومت سے ایک تحقیقاتی کمشن آتا ہے جو یہ معلوم کرتا ہے کہ اصل تکلیف کیا ہے؟ پھر اس تکلیف کو دور کرنے کے اسباب مہیا کئے جاتے ہیں لیکن اللہ رب العالمین پلک جھپکنے میں جتنی دیر لگتی ہے اس سے بھی قبل بندے کی بڑی سے بڑی مصیبت کو رفع کر سکتا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔ جب وہ کسی کام کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو صرف اتنا کہتا ہے کہ ہو جا پھر وہ کام ہو جاتا ہے اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔ کا یہی مطلب ہے یوں ہی اعوذ باللہ کے پڑھنے

میں جو ذکر اللہ ہوتا ہے اس کے آثار فوری طور پر نمایاں ہوتے ہیں اور شیطان بھاگ جاتا ہے۔

۲۔ دوسرا تصور تعوّذ سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ چونکہ اسماء الٰہیہ میں سب سے بڑا اسم اللہ ہے جو اس عظیم ذات سے جڑ گیا اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟

الغرض لفظ اللہ سے ارتباط بالقوی کا تصوّر اجاگر ہوتا ہے یہ تصوّر بھی شیطان کو بھگانے والا ہے۔

۳۔ ایک تیسرا تصور تعوّذ کے آخری لفظ رجیم سے حاصل ہوتا ہے جس کے معنی مردود کے ہیں جب شیطان دربار خداوندی سے مردود ہوا تو وہ ایک مسلمان کیلئے قابل نفرت ذات ہے ایک عقلمند آدمی دوست سے تو دھوکہ کھا سکتا ہے لیکن ایک دشمن سے ہر وقت ہوشیار رہتا ہے۔ پھر یہ دشمن بھی قرآنی بیان کے مطابق عدوّ مبین ہے اس کے اغوا اور بہکانے میں آنا ایک عقلمند سے بعید ہے۔ بشرطیکہ دینی عقل نصیب ہو خلاصہ یہ کہ تعوّذ کی تاثیر عقلاً و نقلاً معقول اور ثابت ہے

سِرِّ وجود

یعنی کیا شیطان کا وجود ہے؟ اس کے عقلی و نقلی دلائل

شیطانی وجود کا راز

آج کل یورپ زدہ معاشرہ اسلام کا مذاق اڑا رہا ہے کہا جاتا ہے کہ قرآن و حدیث میں، شیطان کا ذکر ہے مگر شیطان نظر نہیں آتا اگر یہ مخلوق ہے تو اس کا وجود بھی کہیں ہوتا؟ لیکن یہ بدبخت معترضین قرآن و حدیث پہ اعتراض کرنے سے پہلے اگر غور کر لیتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ بائبل میں بھی شیطان کا ذکر ہے تو بائبل کا انکار بھی کرنا ہوگا۔

بائبل میں بھی شیطان کا ذکر ہے

یہ صرف قرآن و حدیث کی خصوصیت نہیں بلکہ شیطان کا ذکر بائبل میں بھی موجود ہے لیکن بائبل کا شیطان بھی کہیں نظر نہیں آتا؟ اس صورت میں اس کا جواب صرف اسلام کا مسئلہ نہیں بلکہ ادیان سماویہ کے تمام ماننے والوں کو اس کا جواب دینا ہوگا۔

یہودیت و عیسائیت کے پرچار کروں کا بھی فرض ہے کہ میدان میں آئیں اور معترضین کا سامنا کریں۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ سن لیجئے۔

شیطان کے وجود پر ایک لطیفہ

کہ سر سید احمد خاں ایک مرتبہ لاہور آئے اور انکارِ شیطان پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ شیطان کہیں موجود نہیں اگر ہے تو مولوی دکھائیں؟ مجمع میں سے ایک ہوشیار اور تیز قسم کے صاحب اٹھے اور فوراً سر سید صاحب کے سامنے ایک آئینہ لا کر رکھ دیا کہ دیکھئے شیطان موجود ہے؟ سر سید صاحب نے فوراً جواب دیا کہ یہ تو چودہویں صدی کا شیطان ہے اور میں تو بابا آدم کے شیطان کا منکر ہوں تو یہ صاحب چپ ہو گئے لیکن کیا خوب ہوتا اگر یہ صاحب یوں کہہ دیتے کہ چودھویں صدی کا شیطان تیرھویں صدی کے شیطان کی پیداوار ہے اور وہ بارھویں صدی کے شیطان کی پیداوار ہے یوں بابا آدم والے شیطان تک سلسلہ سند جا پہنچتا تو شاید اس کا جواب مشکل ہوتا۔

اسلام میں شیطان کا فوٹو نہیں دکھایا گیا

وجود شیطان کے بیان میں۔ یہاں ایک بات قابل غور ہے اس کو یاد رکھنا ضروری ہے کہ قرآن و حدیث میں شیطان کی ماہیت کے متعلق کوئی نقشہ یا فوٹو نہیں دیا گیا کہ اس کی ٹانگیں اتنی لمبی ہیں اور ہاتھ منہ آنکھ ناک اس طرح ہیں بلکہ صرف اس قدر کہا گیا ہے کہ شیطان ایک نا محسوس ذات ہے جس کو اولاد آدم کے اغوا و اضلال کا کام دیا گیا ہے۔

وجودِ شیطان پر ایک نفسیاتی دلیل

اب شیطان کے وجود پر ایک نفسیاتی دلیل بیان کی جاتی ہے وَھُوَھٰذا دنیا میں خدا ترس اور نیک انسانوں کا فقدان نہیں کہ نیکوں کے وجود ہی سے دنیا خالی ہو کوئی عقلمند ایسا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ہم فرض کرتے ہیں کہ ایک

نیک آدمی اپنے خلوت خانے میں بیٹھ جائے جہاں اس کے پاس کوئی اور آدمی نہ ہو اور یہ بھی ہم فرض کرتے ہیں وہ متقی اور نفس زکیہ کا مالک ہو یعنی وہ شخص متقیانہ اور پرہیزگارانہ زندگی بسر کرنے والا ہو ایسے شخص کو بھی کبھی کبھار گناہ کا خیال دلمیں آجاتا ہے مثلاً چوری کا خیال زنا کا خیال (العیاذ باللہ) اب سوال یہ ہے کہ وسوسہ معصیت جو بحالتِ خلوت ایک نیک انسان کے دل میں آتا ہے یہ ایک امر حادث ہے اور ہر حادث کے لئے ایک سبب کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اس خیالِ معصیت کے لئے بھی جو امر حادث ہے کسی سبب کا ہونا ضروری ہے اب یہاں عقلی لحاظ سے تین احتمال ہی ممکن ہیں اور کوئی احتمال نہیں ہوسکتا۔

گناہ کے تصور میں تین عقلی احتمال

(۱) گناہ کے خیال کا سبب صاحب خلوت کا نفس ہو۔ (۲) کوئی اور انسان ہو۔ (۳) ان دونوں میں سے کوئی نہ ہو بلکہ کوئی غیر محسوس ذات ہو ان تینوں کے علاوہ کوئی چوتھا عقلی احتمال نہیں ہوسکتا۔ احتمال اوّل کہ گناہ کا سبب اس کا نفس ہو اس لئے باطل ہے کہ ہم نے وہ صورت فرض کی تھی کہ صاحب خلوت نفس زکیہ کا مالک ہو اور نہایت نیک ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نیکوں کو بھی ایسے خیالات آتے رہتے ہیں لیکن وہ ان خیالات کو برا سمجھکر توبہ توبہ کرتے ہیں حدیث میں حضور اکرمؐ کے صحابہؓ کے متعلق آتا ہے لَاَنْ نَكُوْنَ حُمَمَةً اَحَبُّ اَنْ نَتَكَلَّمَ بِهَا ۔ (ہمیں جلکر کوئلہ ہو جانا پسند ہے لیکن جو برُے خیالات دلوں میں آتے ہیں زبان سے ان کا تلفظ پسند نہیں ہے) یہ جملہ روایات میں موجود ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان خیالات کو حضرات صحابہؓ پسند نہ کرتے تھے جس سے یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ صاحب نفس زکیہ اور نیک آدمی کا نفس ان خیالات کو مکروہ جانتا ہے وہ نفس خود کیسے سبب بن سکتا ہے یعنی پہلا احتمال غلط ہے کہ گناہ کا سبب صاحب خلوت کا اپنا نفس ہے۔ یہاں اگر یہ اعتراض ذہن میں آئے کہ بعض لوگ زبانی طور پر ایک گناہ کو برا کہتے ہیں لیکن پھر بھی وہ کر گزرتے

ہیں تو یاد رکھنا چاہیئے کہ صرف کراہتِ لسانی کافی نہیں ہے کراہتِ قلبی بھی ضروری ہے جو آدمی صرف زبانی کراہت رکھتا ہے اور قلباً گناہ سے محبت رکھتا ہے ایسا آدمی مذاہب یا عوام کے خوف سے صرف لسانی کراہت کا اظہار کرتا ہے جبکہ ایسا نفس زکیہ نہیں ہوتا اور ہم نے جو صورت فرض کی ہے اس میں صاحب خلوت نفسِ زکیہ رکھنے والا فرض کیا ہے۔

دوسرا احتمال کہ نیک آدمی کو خلوت میں گناہ کا وسوسہ ڈالنے والا کوئی دوسرا انسان ہے تو یہ صورت اس لئے باطل ہے کہ اگر وہاں کوئی دوسرا انسان ہے تو یہ خلوت کہاں ہوئی؟ ہاں تیسرا احتمال کہ برے خیالات ایک نیک آدمی کے دل میں ڈالنے والی کوئی غیر محسوس ذات ہے اور وہ اس امر حادث کا سبب ہے قرآن و حدیث میں اسی ذات کو شیطان کہا گیا ہے اس دلیل سے جو ایک نفسیاتی دلیل ہے شیطان کا وجود ثابت ہوتا ہے۔

جہاں تک قرآن و حدیث کا تعلق ہے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ شیطان جنوں میں سے ہے اور اس کے کارندے جس طرح جنوں میں سے ہوتے ہیں انسانوں میں سے بھی ہوتے ہیں شیطان کا انکار صریح نصوص قطعیہ کا انکار ہے اور اس ضمن میں مغرب زدہ طبقے یا دشمنانِ دین کی کاروائیاں نہ صرف تاویل باطل بلکہ قرآنی نصوص کی واضح تحریف ہے جس کے کفر بواح (واضح کفر) ہونے میں قطعاً شک و شبہ کی گنجائش نہیں قرآنی آیات اور احادیث کی ایسی تاویلات کہ جن سے ان کا اصل حلیہ ہی بگڑ جائے پھر پوری امت کا تعامل ان سب کے خلاف ہو یہ کونسا اسلام ہے۔

سرِّ تخلیق

یعنی ذاتِ شیطان جو شرِّ محض ہے آخر اس کی تخلیق سے کیا فائدہ ہے؟ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حکیم مطلق ذات رب العلمین نے اس چشمۂ شرّ کو کیوں پیدا فرمایا؟

اصل بات یہ ہے کہ یہ بھی ایک تقدیری مسئلہ ہے اسلام میں یہ بہت پیچیدہ مسئلہ ہے اسی لئے بزرگ کہتے ہیں کہ ایسے مسائل میں ہاتھ نہ ڈالنا چاہیئے لیکن کیا کیا جائے ہم جس زمانے میں

ہیں اس دور میں دین اسلام کی صداقت پر اپنی بے بضاعتی کے باوجود عقلی دلائل اور حکمت بیان
کرنے پر مجبور ہیں اب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اگر منبع شر کی تخلیق میں حکمت ثابت کر دیں تو پھر کسی
اور مخلوق کا نام لینا عبث ہوگا کیونکہ مخلوق میں اخبث ترین شیطان ہی ہے۔ دلائل اور حکمتیں
ملاحظہ ہوں۔

دلیل اوّل۔ تکمیل انسانیت

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ شرفِ انسان کا مدار حب الٰہی پر ہے۔

اور انسانوں میں دیگر جذبات کی طرح محبت الٰہی کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے جس پر قرآنی حدیثی دلائل اور
تاریخی شواہد موجود ہیں انسان اور خدا کے درمیان محبت کا ایک رابطہ بھی ہے محبت قلب کا
ایک پوشیدہ جذبہ ہے دنیا میں اس کا مظہر شریعت مطہرہ ہے یعنی خدا کی پسند و ناپسند جس کو
علمی اصطلاح میں مامورات اور منہیات کہا جاتا ہے۔ اس فطری جذبہ محبت الٰہی کی تکمیل اتباع
سے ہوگی اور اس کا معیار یہ ہے کہ جب ایک انسان شریعت کے احکامات پر چلے یعنی مامورات و
منہیات بجا لائے تو سمجھا جائیگا کہ محبت سچی ہے ورنہ جھوٹی اس حقیقت کو قرآن پاک میں یوں
بیان کیا گیا ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ الاية
اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا، معلوم ہوا کہ شریعت پر
چلنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص محبوب خدا کا مقام پاتا ہے الغرض اتباع شریعت مظہر محبت
ہے اس سے ہٹ کر محبت کا دعویٰ ایک مذاق ہے۔ اس بیان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ
تکمیل انسانیت کیلئے تکمیلِ محبت الٰہی ضروری ہے اگر محبت کاملہ ہے تو انسان کامل ورنہ ناقص ہے
عالمی فلسفہ کا ایک مشہور قاعدہ ہے کہ رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے جب ایک حقیقت ظاہر ہوتی ہے
تو وہ کامل ترین کامیاب ہوتی ہے الشیئ اذا تحقق مع الموانع کان اکمل۔
کا یہی مطلب ہے۔

حب الٰہی کی تکمیل کی ایک محسوس مثال

اس کو

ایک مثال سے یوں سمجھا جائے کہ ایک فن ہے جس کو عربی میں فنِ فروسیت فارسی میں چابکداری
اور اردو میں گھوڑ سواری کہتے ہیں گھوڑ سواری کے فن کی تکمیل چونکہ تدریجی ہوتی ہے اس لئے
جب کسی کو یہ فن سیکھنا ہوتا ہے تو پہلا درجہ یہ ہوتا ہے کہ گھوڑے پر زین کسی جاتی ہے اس میں رکاب
بھی ہوتے ہیں اور گھوڑے کو لگام بھی دی جاتی ہے پھر سیکھنے والے کو اس پر سوار کیا جاتا ہے
اور گھوڑے کو دوڑا کر اس فن کو سیکھنے کی ابتدا ہوتی ہے. اور جب کوئی شخص یہ درجہ طے کر لیتا
ہے اور اس میں کامل ہو جاتا ہے تو پھر دوسرا درجہ شروع کیا جاتا ہے اور اب زین ہٹالی جاتی ہے
گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر صرف لگام کے ساتھ گھوڑے کو دوڑا کر اس فن میں مہارت پیدا کی
جاتی ہے جب اس میں بھی کمال پیدا ہو جاتا ہے تو پھر تیسرا درجہ شروع کرنے کے لئے لگام بھی
ہٹالی جاتی ہے اور بغیر لگام و رکاب کے گھوڑے کی برہنہ پشت پر سواری کی جاتی ہے مشق کرنے
کے بعد جب اس میں کمال پیدا ہو جاتا ہے تو پھر آخری درجہ یہ ہوتا ہے کہ گھوڑ دوڑ کے میدان
میں خس کی ٹٹیاں رکھدی جاتی ہیں اور سوار اپنا گھوڑا ان پر دوڑاتا ہے یہ مشکل مرحلہ ہوتا ہے گھوڑا
خس کی ٹٹیوں میں الجھ کر کسی وقت بھی حادثہ کا شکار ہو سکتا ہے اگر ایک سوار مشق کے بعد یہ مرحلہ
بھی کامیابی سے طے کر لیتا ہے تو پھر سندِ فروسیت یعنی گھوڑ سواری کی ڈگری مل جاتی ہے.
اور پھر شہسوار کہلاتا ہے یہ ڈگری آسانی سے نہیں ملتی اس ڈگری کے حصول کیلئے رکاوٹوں اور
موانعات کے سمندر عبور کرنے ہوتے ہیں.

اس مثال کو سامنے رکھ کر یوں سمجھئے کہ اس دنیا میں بدنِ انسانی ایک گھوڑا ہے اور روح
انسانی جو امرِ خداوندی ہے اس کا سوار ہے. دنیا کے میدان میں خس کی ٹٹی کے قائمقام شیطان
ہے جو شریعت کی صاف ستھری سڑک (صراطِ مستقیم) پر رکاوٹیں ڈال کر بیٹھا ہوا ہے. ان شیطانی
رکاوٹوں سے چھلانگ لگا کر ہم نے پار ہونا ہے. تب جا کر تکمیلِ انسانیت کا ثمرہ اور ڈگری جنت
کی شکل میں ہمیں نصیب ہوگی قرآن پاک میں ایک جگہ شیطان کے اس چیلنج کا ذکر ہے. جو اس نے
اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا تھا. لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ

(میں ضرور آپ کی سیدھی راہ پر بنی آدم کو بہکانے کے لئے بیٹھوں گا)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شیطان کی روکاوٹوں کے نتیجے میں اولادِ آدم کو جنت کی عظیم
[کامیا]بی ملے گی تو اس کی تخلیق کس قدر پر از حکمت ہے جبکہ لاکھوں اولیاء صالحین شہداء ابرار و اتقیاء
[کی تک]میل اس شیطان کی وجہ سے ہے وہ اپنی ذات کے اعتبار سے جو کچھ بھی ہے ہمیں تو یہ دیکھنا ہے
[کہ] وہ ہمارے فائدے کا باعث ہے۔ فلسفیانہ اصطلاح میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ شیطان بالذات
شر ہے مگر بالغیر خیر ہے یعنی خیر کا کسی درجہ میں ذریعہ بن جاتا ہے۔

خیر و شر کے لحاظ سے مخلوق کی تقسیم

اس جہان میں جسقدر بھی مخلوق ہے اس کی چند قسمیں ہیں۔ (۱) خیر محض (۲) شر محض (۳)
[خ]یر اور شر سے مرکب۔ جو چیزیں خیر اور شر سے مرکب ہیں ان کی تین قسمیں ہیں۔
(۱)۔ خیر و شر مساوی ہوں (۲) شر زیادہ ہو (۳) خیر زیادہ ہو۔ ان پانچوں صورتوں میں شر محض
اور وہ صورت جس میں خیر و شر برابر ہوں اس صفت کی دنیا میں خدا نے کوئی مخلوق پیدا نہیں کی
نہ ہی جس میں شر زیادہ ہو اور خیر کم ایسی مخلوق بھی خدا نے پیدا نہیں کی اس لئے کہ یہ صورتیں اس
کی تخلیق حکمت کے خلاف ہوتیں دنیا بھر میں صرف دو قسم کی مخلوقات پائی جاتی ہیں ایک خیر
محض اور دوسری وہ صورت جس میں خیر بہ نسبت شر کے زیادہ ہو۔ شیطان بھی اسی مخلوق میں
شامل ہے جس میں خیر غالب ہے اس لئے کہ شیطان دین کی تکمیل کا سامان مہیا کر رہا ہے۔ یہ
درست ہے کہ ایمان والوں کی نسبت کافر زیادہ ہیں مگر دیکھنا تو یہ ہے کہ کافروں کے کفر میں شیطان
کا کتنا حصہ ہے اور کافروں کے نفس کا کتنا حصہ ہے کافروں کے کفر میں ان کے نفس کا حصہ
شیطان سے زیادہ ہے گویا کفر میں بھی شر مغلوب ہے ایک اور مثال یوں سمجھیں کہ اسلام میں جہاد
کس قدر اجر و ثواب کا ذریعہ ہے لیکن اگر کافر نہ ہوتے تو جہاد کس سے کیا جاتا یعنی مجاہد اور غازی کا

کی ڈگری ہمیں کیسے مل سکتی ہے یونہی کافروں کو تبلیغ کرنے کا اجران کے کفر ہی کی وجہ سے ہمیں ملتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آدھے دن کی تبلیغ دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے۔ عارف شیرازی نے ایک شعر میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

در کارخانہ عشق از کفر ناگزیر است

دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

(عشق کے کارخانے میں کفر کے سوا چارہ کار نہیں اگر بولہب نہ ہوتا تو دوزخ کسے جلاتی؟)

وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْأَشْيَاءُ (ہر چیز اپنی ضد سے ظاہر ہوتی ہے)

دلیل دوم۔ دینی ڈیفنس

شیطان کی پیدائش کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ ہمارے اندر ایمان کا تحفظ اور دفاع کا جذبہ مضبوط ہوجاتا ہے دیکھیے جس گھر میں چور ڈاکو کا خطرہ ہوتا ہے تو اس کے لئے حفاظتی انتظامات مضبوط کئے جاتے ہیں اور اگر ڈاکو کا خطرہ نہ ہو تو پھر انسان ٹانگیں پھیلا کر سو جاتا ہے یوں تحفظ کا جذبہ ختم ہوجاتا ہے دینی محنت اور مشقت شیطان کی وجہ سے ہے۔

گناہوں کے کمالات

حجۃ الاسلام حضرت امام غزالیؒ نے ایک موقع پر گناہوں کے کمالات بیان کرتے ہوئے اس موضوع پر عجیب باتیں فرمائی ہیں مثلاً اگر چور نہ ہوتا تو تالا بنانے والی کی روزی کا سامان کہاں سے ہوتا اس میں شک نہیں کہ گناہ اللہ کی نافرمانی اور دوزخ میں جانے کا سبب ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اختلاف انتساب سے احکام مختلف ہوجاتے ہیں یعنی نسبت کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں مثلاً کفر کو اگر کافروں اور نافرمانوں کی طرف منسوب کیا جائے تو کسب کی وجہ سے شر ہے اور اگر کفر کو صرف پیدا کرنے کی وجہ سے خالق کی طرف منسوب کیا جائے تو خیر ہے مولانا رومی نے اپنے ایک شعر میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے۔

کفر ہم نسبت با خالق رحمت است　　چوں کنی نسبت بما کفر آفت است

(کفر کی نسبت خالق کی طرف رحمت ہے جب اس کفر کی نسبت ہماری طرف کرو تو یہ ایک آفت و مصیبت ہے)

اگر ایمان ایک کمال ہے تو اس کا تحفظ بھی ضروری ہے جیسے کسان کھیت کا تحفظ کرتا ہے۔ حکومت اپنے خزانہ اور بنکوں کی حفاظت کرتی ایمان چونکہ ایک پوشیدہ اور مخفی خزانہ ہے اس لیے عام ڈاکو تو اس تک نہیں پہنچ سکتے مگر ایک مخفی اور غیر محسوس ڈاکو شیطان ایمانی دولت پر ڈاکہ ڈالنا چاہتا ہے اسی لیے قرآن و حدیث میں شیطان کے تفصیلی حالات اور انسانی دشمنیوں کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس دولت کی حفاظت کا خیال ایک مسلمان کے دل و دماغ میں ہر وقت تازہ رہے۔

شیطان کی تخلیق کی تیسری حکمت تحمل مشکلات کا خوگر بنانا ہے

یہ حقیقت ہے کہ نکما آدمی نہ دین کا ہوتا ہے نہ دنیا کا ایک محنت کش اور مشکلات برداشت کرنے کا خوگر انسان دین دنیا میں کامیاب رہتا ہے قرآن پاک میں ایک جگہ ارشاد خداوندی ہے۔ مَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ۔ (جو محنت کرتا ہے تو اپنے فائدے کے لیے ہی محنت کر رہا ہے) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے امتحان کے لیے ان کا ایک عظیم دشمن پیدا کر کے کھڑا کر دیا ہے اور ساتھ ہی شیطان سے بچنے کا حکم دیا اس کا نتیجہ ہے کہ جب ایک مسلمان کے دل میں گناہ کی بات آتی ہے تو اس کو شیطان کی طرف منسوب کرتے ہوئے ، محنت مشقت سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے یوں ایک مومن کی زندگی مسلسل جہاد بن جاتی ہے اور ایسا شخص بے فکری کی زندگی نہیں گزارتا بلکہ ہر وقت دشمن کی طرف سے کسی بھی حملے کو روکنے کی فکر میں رہتا ہے شیطان کو پیدا کرنے کا یہ ایک عظیم فائدہ ہوا کہ ایک مسلمان ہر وقت چوکنا رہتا ہے اور ایک مجاہد کیطرح سپاہیانہ زندگی کا خوگر بن جاتا ہے۔

چوتھی حکمت مضبوط دشمن کا وجود اپنی قوت میں اضافہ کا سبب ہوتا ہے

انسان کے اندر ایک حکومت ہے جس کو حکومتِ صغریٰ کہا جاتا ہے انسانی روح اس حکومت صغریٰ کا حکمران ہے جبکہ انسانی اعضا کی حیثیت رعیت کی ہے اور حواسِ ظاہرہ و باطنہ وزراء ہیں حکومت صغریٰ کے بالمقابل دنیوی حکومتیں حکومتِ کبریٰ کہلاتی ہیں۔ قوت و ضعف میں حکومتِ صغریٰ کا معاملہ حکومت کبریٰ جیسا ہے اس چھوٹی حکومت کو حکومت نفسی اور بڑی حکومت کو حکومتِ آفاقی بھی کہا جاتا ہے مثال کے طور پر حکومتِ پاکستان یا حکومتِ بھارت کبریٰ حکومتیں ہیں ان حکومتوں کے استحکام مضبوطی اور تقویت میں جو چیز مؤثر ہے وہ حکومت مجاورہ قویہ (مضبوط پڑوسی) کا وجود ہے اگر پاکستان کے پڑوس میں بھارت کے بجائے، کوئی چھوٹی سی ریاست ہوئی یا کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہوتیں اور بے شک وہ پاکستان کے خلاف ہوتیں لیکن پاکستان بری بحری فضائی طاقت کے لحاظ سے اسقدر مضبوط نہ ہوتا جس قدر خدا کے فضل سے آج ہے دشمن مضبوط نہ ہونے کی بنا پہ دفاعی بجٹ معقول نہ ہوتا بلکہ یہ کہا جاتا کہ بلا، ضرورت دفاع پہ عظیم بجٹ بنانا ملکی دولت کو ضائع کرنا ہے پھر فوجی مشقیں اور تیاریاں بھی متاثر ہوتیں لیکن اب چونکہ ہمارے پڑوس میں بھارت جیسا قوی دشمن موجود ہے اس کی دشمنی نے پاکستان کو مستحکم اور مضبوط بنانے کی ترغیب دی ہے۔ اب وہ قاعدہ بالکل صاف ہو کر سامنے آ گیا کہ قوی دشمن کا وجود اپنی طاقت کا سبب ہوتا ہے۔

حکومتِ نفسی کا حکومتِ آفاقی پر قیاس

یوں ہی جب ہم حکومت نفسی کو حکومتِ آفاقی، (ظاہری) پہ قیاس کرتے ہیں کہ ایک طرف انسانی روح کی حکمرانی ہے اور اس کے مقابلے میں مقتل اعظم شیطان ہے اس کی دشمنی کا تصور کرتے ہوئے ایک مسلمان (خدا کا سپاہی) جب اپنی اخلاقی، دینی اور عقلی تدابیر سے مسلح ہو کر سامنا کرے گا تو وہ ایک مضبوط دشمن (شیطان) کے مقابلے میں

اپنے دین کے تحفظ کے لیے اور غلبے کے لیے بھرپور کوشش کرے گا یوں ایمانی لحاظ سے ایک مسلمان قوی اور مضبوط ہو جائے گا۔ الغرض شیطان جیسی شریر ذات میں بھی خدا نے ہمارے لیے دینی فوائد رکھے ہیں۔ شیطان نہ ہوتا تو ہم دینی طور پر نکمے ہو جاتے۔ بے شک وہ اپنی ذات میں ایک خطرناک دشمن ہے لیکن غیرت مند مسلمان کے لیے ایمانی قوت کا سبب بھی ہے۔

حضرت نانوتویؒ کا ارشاد

حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے اس ضمن میں قابل قدر بات ارشاد فرمائی ہے کہ شر انفرادی حیثیت میں شر ہوتا ہے جب اجتماعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس میں خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے مثال دیتے ہوئے فرمایا ﴿كَخَالِ الْمَعْشُوْقِ﴾ (جیسے کہ محبوب و معشوق کا تل ہوتا ہے) انفرادی حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ ایک بدنما داغ اور دھبہ یا کالا پن ہے جس میں کشش کی کوئی وجہ نہیں لیکن اجتماعی حیثیت سے وہ جسم یا اس کے کسی حصے مثلاً چہرے کے حسن کو دوبالا کرنے والی چیز ہے یہی حال تخلیق شیطان کا ہے کہ اس میں بھی حکمتیں ہیں اور اس کو پیدا کرنے میں اس دنیا کی رونق مضمر ہے۔

حضرت سید علی ہجویریؒ کا ارشاد

حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ المعروف داتا گنج بخش کے متعلق منقول ہے کہ ان کے ایک مرید کو اس کے کسی پڑوسی نے تنگ کر رکھا تھا مرید نے حضرت سے اپنی مظلومیت کی داستان بیان کی حضرت نے جواباً فرمایا تم جس کو داستانِ غم سمجھ کر بیان کر رہے ہو یہ غم کی بات نہیں بلکہ خوشی کی بات ہے باعثِ ضرر نہیں بلکہ فائدہ کی چیز ہے، حضرت نے درج ذیل اپنے اشعار میں اسی حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔

گر تو میدانی عدو ہم یار تست ؛ ہستیٔ او رونق بازار تست

کشت انسان را عدو باشد سحاب ؛ ممکن آتش را برانگیزد ز خاک

ہر کہ دانائے ز اسرار خود است ؛ فضلِ حق داند گر دشمن قوی است

واقعی اگر دشمن نہ ہو تو انسان غافل ہو جاتا ہے دشمن کے وجود سے انسان کی پوشیدہ قوتیں نمایاں ہوتی ہیں اور ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

تعوّذ کا اخلاقی سبق

استعاذہ کا اخلاقی پہلو یہ ہے کہ شیطانی دشمن کا پختہ تصور اور اپنے آپ کو اس کے وار سے بچانے کے لئے مناسب فکر و تدبیر کرنی ہے جب ہم اعوذ باللہ کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دفع مضرت کے لئے جائے پناہ اللہ کی ذات ہے اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے اعوذ کے بعد باللہ میں با استعانت لائی گئی ہے گویا ایک بندہ یوں کہتا ہے کہ دفع مضرت (تکلیف کا دور کرنا) صرف اللہ کی امداد سے ممکن ہے قرآن پاک میں ایک جگہ اسی حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۔ الآیۃ
اور اگر تم کو اللہ کی طرف سے تکلیف پہنچے تو اس کو سوائے اللہ کوئی دور کرنے والا نہیں۔

الغرض تعوذ کے اخلاقی پہلو کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہر مصیبت میں تکلیف کو دور کرنیوالا اور جائے پناہ سوائے اللہ کی ذات کے اور کوئی نہیں اس لئے اس سے وابستگی لازمی ہے۔

سیاسی سبق

اعوذ باللہ سے سیاسی سبق یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایک مسلمان تَغَلُّب عَلَى الأَعْدَاء دشمنوں پر غالب رہنے اور غلبے کو حاصل کرنے کے لئے ہر وقت فکر مند رہے۔ جب ایک مسلمان کی زندگی انفرادی طور پر مخفی دشمن کو مغلوب کرنے کے تصور سے بھرپور ہوگی تو پھر اجتماعی طور پر مسلمان اپنے ظاہری اور باطنی دشمنوں کو مغلوب کر سکیں گے اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ یہودی وعیسائی اور ہنود تمام غیر مسلم طاقتیں مسلمانوں کی دشمن ہیں اسی کو حدیث پاک میں بیان فرمایا ہے۔

اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ (تمام کافرانہ قوتیں اسلام کے مقابلے میں ایک ملت ہیں)

آج اگر مسلمانوں کے اذہان میں یہ تصور مستحکم ہو کہ سطح ارض پر صرف دو قومیں ہیں ایک نام مسلم اور دوسری کا نام کافر ہے۔ تو پھر یہ برا وقت ہم پر کبھی نہ آتا کہ غیر مسلم قوتوں سے مسلمان دبے

ہوئے دکھائی دیتے ہیں اصل بات یوں ہے کہ ہم قرآن کی اس دعوت کو بھول گئے ہیں کہ دشمن کو دشمن ہی سمجھیں یہ وہ راز ہے جس کو مسلمانوں کی بجائے کافر تو نہیں خوب سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمان متحد ہو کر ایک قوت بن جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت ان کو مرعوب نہیں کر سکتی اسی کا نتیجہ ہے کہ عالم اسلام میں دین اور اسلام کے نام سے جب کوئی تحریک اٹھتی ہے تو روس اور امریکہ فکر مند ہو جاتے ہیں اور پھر وہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوششیں کرتے ہیں مسلمان اسلام کی حقیقت سے دور ہونے کی بنا پر اس سازش کا شکار ہو جاتے ہیں اسلام دشمن قوتیں اسلام کو اس لئے شکست نہیں دے سکتیں کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خدا نے لی ہوئی ہے۔ لیکن وہ مسلمانوں کی کمزوریوں سے واقف ہیں اس لئے کوئی ایسا موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جو مزید کمزوریوں کا باعث بنے دشمنوں کا حملہ صرف سیاسی ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ علم کے راستے سے بھی مسلمانوں پر وار کرتے رہتے ہیں میرے نزدیک یورپ کی کوئی علمی تحریک علمی کم اور سیاسی زیادہ ہوتی ہے الغرض، تعوذ باللہ کا سیاسی سبق یہ ہے کہ مسلمان اپنے ظاہری اور باطنی دشمن پر غالب آنے کی کوشش کریں اسی کا نام اسلامی سیاست ہے۔

(تعوذ کا بیان ختم ہوا)

تسمیہ کی تفسیر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

(شروع اللہ کے نام سے جو مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے)

عظمتِ تسمیہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت جس کو ابوعوانہ نے صحیح کہا ہے اور حافظ ابن صلاح نے اس کی تحسین کی ہے اور حافظ ابن حجر نے قرہ بن عبدالرحمٰن راوی کی وجہ سے اگرچہ اس کی تضعیف کی ہے مگر چونکہ قرہ بن عبدالرحمٰن کا متابع عبدالعزیز ہے اس لئے یہ روایت حسن کے درجہ میں ضرور ہے۔ حدیث کے الفاظ یوں ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

كُلُّ أَمْرٍ ذِي بَالٍ لَمْ يُبْدَأْ بِبِسْمِ اللهِ فَهُوَ أَبْتَرُ۔

ہر وہ کام جو عظیم الشان ہو اگر اس کا آغاز بسم اللہ سے نہ کیا جائے تو وہ بے برکت ہوتا ہے۔

اوائل طبقات شافعیہ میں تاج الدین سبکیؒ نے بھی اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ کو علماء کی اصطلاح میں تسمیہ کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک بحث یہ ہے کہ باکا عامل کیا ہے؟ پھر وہ عامل فعل متقدم ہے یا مؤخر ہمارے نزدیک باکا عامل فعل ہے اور وہ مؤخر ہے۔ مؤخر ماننے میں حصر کا فائدہ ہوگا یعنی امداد یا برکت صرف اللہ۔ رحمٰن۔ رحیم سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ عبارت کی تقدیر یوں ہوگی بِسْمِ اللهِ أَقْرَأُ یا أَشْرَعُ۔ (اللہ ہی کے نام سے پڑھتا ہوں یا شروع کرتا ہوں)

حذفِ عامل کا نکتہ

تسمیہ میں باکا عامل محذوف ہے اس کی وجہ

یہ ہے کہ حدیث مذکورہ بالا کی بنا پر تمام جائز کاموں کا آغاز بسم اللہ سے ہونا چاہیئے۔ اور افعال غیر محصور ہیں اگر با کا عامل فعل ہر جگہ ذکر کیا جاتا اور محذوف نہ ہوتا تو کلام میں طوالت پیدا ہو جاتی۔ یوں تو بسم اللہ ہی ایک پارے کے برابر ہو جاتی۔ اس طوالت سے بچنے کے لئے با کے عامل فعل کو مقدّر مانا گیا ہے۔ اور ہر جائز فعل اس کا قرینہ ہوگا مثلاً پڑھنے والا کہے گا بِسْمِ اللّٰهِ اَقْرَأُ اور کھانے والا کہے گا۔ بِسْمِ اللّٰهِ اٰكُلُ اور پینے والا کہے گا بِسْمِ اللّٰهِ اَشْرَبُ وغیرہ ذٰلک الغرض جیسا کام ہوگا ویسے ہی فعل بھی مقدّر سمجھا جائے گا۔ بعضوں نے با کا عامل فعل، اَشْرَعُ مانا ہے (میں شروع کرتا ہوں) یہ ایک جامع فعل ہے۔ جو ہر کام کے وقت مقدّر مانا جا سکتا ہے۔ مثلاً اردو میں یوں کہا جائے گا کہ اللہ کے نام سے کھانا شروع کرتا ہوں یا پینا شروع کرتا ہوں یا پہننا شروع کرتا ہوں۔ بہر حال تسمیہ میں با کے عامل فعل کو حذف کرنے کا نکتہ یہ ہوا کہ کلام میں طوالت سے بچنا لازمی تھا جو حاصل ہو گیا۔

الرحمٰن الرحیم

رحمٰن اور رحیم دونوں اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں۔ علماء کی تحقیق کے مطابق یہ دونوں صفت مشبّہ کے صیغے ہیں مگر اس پر اعتراض ہے کہ صفت مشبّہ افعال لازمہ سے آتا ہے متعدّی افعال سے صفت مشبّہ نہیں آتا۔ چونکہ رَحِمَ جو سَمِعَ کے باب سے متعدی ہے تو جن ائمہ صرف نے رحمٰن و رحیم کو صفت مشبّہ قرار دیا ہے انہوں نے یہاں انتقال الی اللازم والی کارروائی کی ہے یعنی ان کی توجیہ یہ ہے کہ رَحِمَ کو فَعُلَ کے وزن رَحُمَ (بضمّ العین) کی طرف منتقل کیا گیا ہے اور فَعُلَ لازمی ہے اس لئے اس سے صفت مشبہ کے آنے پر کوئی سوال نہیں ہوگا۔

رَحِمَ (بکسر العین) رَحُمَ (بضمّ العین) کے معنی میں فرق

رحمٰن و رحیم کا مادہ رحمت ہے جس کے معنی فیضان خیر کے ہیں اصل بات یوں ہے کہ فیضان خیر کا جو جذبہ قبل از ظہور ہو۔ رَحُمَ (بضمّ العین) کے قبیل سے ہوتا ہے۔ اور اگر بعد از ظہور ہو تو رَحِمَ

(بِکَسْرِ الْعَیْن) کے قبیل سے ہوگا۔ اس کی ایک محسوس مثال یوں سمجھئے کہ کسی نے ایک معذور لنگڑے کو سڑک پہ دیکھا اور جذبہ خیر پیدا ہوا تو یہ از قبیلہ (رَحُمَ بِضَمِّ الْعَیْن) ہے پھر اگر حسب توفیق اس معذور کی امداد کر دی تو یہ (رَحِمَ بِکَسْرِ الْعَیْن) کے باب سے ہوگا۔

سید محمود آلوسیؒ کی رائے رحمٰن و رحیم کے بارے میں

صاحب روح المعانی سیّد محمود آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ رحمٰن رحیم صفت مشبّہ کے صیغے نہیں بلکہ فَعْلَان اور فعیل کے وزن پر مبالغے کے صیغے ہیں رَحْمٰن اور رَحِیْم کا معنی اس صورت میں کثیر الرحم (بہت زیادہ رحمت کرنے والا) ہے ہمارے نزدیک یہ معنی قرآنی ذوق کے زیادہ مطابق ہے اب چونکہ یہ فعل بھی متعدی ہوگا اس لئے لازمی بنانے والی کاروائی کی بھی ضرورت نہیں۔

تسمیہ کے مباحث اور اسمائے باری تعالےٰ

یہاں تین چیزیں بیان کرنی ہیں ایک لفظ اسم کا اضافہ دوم بظاہر دو صفتوں کا مکرّر آنا سوم رحمٰن و رحیم کی ترکیب۔ پہلی چیز یہ ہے کہ تسمیہ میں سب سے پہلے لفظ اسم لایا گیا ہے۔ أسماء اسم کی جمع ہے جس کے معنی نام کے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اسماء خداوندی گویا اللہ تعالیٰ کی حکومت کے مختلف محکموں کے نام ہیں۔ مثلاً انسانی محکموں میں ہر محکمہ کا ایک انچارج ہوتا ہے۔ اور مختلف حاجات کا تعلق محکمہ کے انچارج سے ہوگا۔ دنیا کی حکومتوں میں تعلیمی مسائل کا تعلق محکمہ تعلیم کے انچارج سے ہے علاج معالجے اور ادویہ کا تعلق محکمہ صحت سے ہے وغیرہ ذلک۔

تو اس دنیا میں عمل کی تقسیم اشخاص پہ ہے۔ شیخ اکبرؒ نے فتوحات مکیہ میں لکھا ہے کہ اللہ کی حکومت کبریٰ میں اسماء، اشخاص کے قائم مقام ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں مثلاً حیوانات نباتات اور انسانوں کو جو روزی مل رہی ہے اس کا تعلق محکمہ خوراک کے انچارج کے بجائے اللہ رب العالمین کے اسم رَزَّاق سے ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ ۔ (بے شک اللہ ہی رزق دینے والا ہے جو مضبوط قوت کا مالک ہے)

اسی طرح امن و عافیت اور سلامتی کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اسم مؤمن سے ہے اور مجرمین کو سزا دینے کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اسم مُنْتَقِمْ سے ہے وغیرہ ذالک۔

صفات باری تعالےٰ کے متعلق لاعین و لاغیر کی تشریح

ترتیب کے لحاظ سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ ذات باری۔ صفات باری۔ اسماء باری یہ تینوں الگ الگ چیزیں ہیں مگر ان تینوں کا مصداق ایک ہی ذات ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ایک عام فہم مثال یوں ہو سکتی ہے کہ اس دنیا میں ایک آفتاب (سورج) ہے دوسری وہ روشنی ہے جو آفتاب کے جرم (جسم) کے ساتھ متعلق ہے تیسری آفتاب کی وہ روشنی ہے جو زمین کی سطح پر پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ ہم اس کو تشبیہ تو نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تشبیہ سے پاک ہے لیکن سمجھانے کے لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ جِرمِ شمس (سورج کا جسم) بمنزلہ ذات باری ہے اور وہ روشنی جو جرم شمس کے ساتھ قائم ہے بمنزلہ صفات باری تعالیٰ ہے اور وہ روشنی جو زمین پر پڑتی ہے۔ بمنزلہ افعال کے ہے۔ تو اب بات یوں ہوئی کہ آفتاب بمنزلہ ذات باری ہے اور روشنی بمنزلہ صفات باری ہے۔ یہ روشنی آفتاب کا نہ عین ہے اور نہ غیر ہے اس مثال سے صفات باری کے متعلق لَاعَیْنٌ وَلَاغَیْرٌ۔ کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے۔ مثال مذکور میں سورج کی وہ روشنی جو زمین کی سطح پر پھیلی ہوئی ہے، وہ بمنزلہ افعال خداوندی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ پوری کائنات پر رحمتِ خداوندی پھیلی ہوئی ہے انسان ہوں یا حیوان نباتات ہوں یا جمادات عالم بالا کی مخلوق ہو، یا عالم سفلی کی یہ سب مخلوق رحمتِ خداوندی کا مظہر ہے۔ الغرض جس طرح سورج کی دھوپ کو سورج کے ساتھ تعلق ہے یونہی اس کائنات پر پھیلی ہوئی رحمت کو بھی حق تعالیٰ سے تعلق ہے اسی رحمت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی صفت رحمان اور رحیم ہے۔

اسمائے الٰہی (ننانوے ۹۹) کی تشریح

ترمذی شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

اِنَّ لِلّٰہِ تِسْعَۃً وَّتِسْعُوْنَ اِسْمًا مِائَۃً اِلَّا وَاحِدًا مَنْ اَحْصَاھَا دَخَلَ الْجَنَّۃَ اَوْکَمَا قَالَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ مَنْ حَفِظَھَا

بے شک اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔ یعنی ایک کم ایک سو جو ان کو یاد کرلے جنت میں جائے گا۔

اور ایک روایت میں مَنْ اَحْصَاھَا کے بجائے مَنْ حَفِظَھَا آیا ہے۔

یہ حدیث بخاری اور مسلم میں بھی ہے لیکن ننانوے ۹۹ ناموں کا ذکر صرف ترمذی میں ہے اس لیے حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ میں ننانوے ۹۹ والی روایت سے مطمئن نہیں ہوں ان کے نزدیک یہ معیاری روایت نہیں فتح الباری میں حافظ نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے صفات اور نام جہاں مذکورہ ہیں ان کا انتخاب کر کے جمع کیے ہیں اور پھر ننانوے کی تعداد بتائی ہے شارحین حدیث کا اس پر اتفاق ہے کہ اسمائے الٰہیہ ننانوے میں بند نہیں۔

قرآنی آیت کلمٰت ربی کا مطلب

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ نے ایک کتاب شرح اسماء اللہ الحسنیٰ لکھی ہے اس کتاب سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسمائے باری تعالیٰ کمالات باری تعالیٰ کی طرح غیر منتہی اور غیر محصورہ ہیں قرآن پاک سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ارشاد ہے۔

قُلْ لَّوْکَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْجِئْنَا بِمِثْلِہٖ مَدَدًا۔

آپ فرما دیجئے اگر میرے رب کے کلمات لکھنے کے لیے سمندر روشنائی بن جائیں تو میرے رب کی باتیں تمام ہونے سے پہلے سمندر تمام ہو جائے گو اس کی مدد کو ہم ایسے ہی سمندر لائیں۔

اس آیت میں کلمات ربی سے مراد کمالات خداوندی ہیں صرف باتیں مراد نہیں ورنہ کوئی کہہ دے گا کہ خدا باتونی ہے (العیاذ باللہ) جب کلمات سے مراد کمالات ہوں تو کوئی سوال نہیں ہوگا اور کمالات خداوندی کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ اگر سمندر روشنائی بن جائیں اور دنیا بھر کے درخت قلمیں بن جائیں یہ سب ختم ہو سکتے ہیں یہ کمالاتِ خداوندی پھر بھی ختم نہ ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں غیر محدود ہے۔ کلمات یعنی اسماء اللہ دال ہیں کمالاتِ اللہ وصفاتِ اللہ پر چونکہ یہ دونوں غیر محدود ہیں اس لئے "کلماتِ ربی" بھی غیر محدود ہیں۔

اسماءِ خداوندی حکومتی محکموں کے قائم مقام ہیں

شرح اسماء کے سلسلے میں غزالی رحمۃ اللہ نے اور پھر شیخ اکبرؒ نے فتوحات مکیہ میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حقیقت میں کاروبارِ خداوندی کے محکمے ہیں مثلاً روزی کا مسئلہ محکمہ رزاقیت سے متعلق ہے۔ تعلیم کا مسئلہ اسمِ علیم کے تحت ہے بیماری اور شفا از امراض کا مسئلہ اسمِ شافی سے متعلق ہے وغیرہ ذالک۔ اس لحاظ سے حکومتِ الہیہ کے جملہ محکمہ جات کی تعداد حسب روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ننانوے ۹۹ ہوئی۔ پھر جس طرح ہر محکمہ کا اپنا اپنا عملہ ہوتا ہے جس میں مختلف ملازم کام کرتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ہر اسم کے خدام فرشتے ہیں جو حکم کے مطابق فرائض انجام دیتے ہیں اس بات کی تائید قرآنِ پاک میں سورۃ نازعات کی ایک آیت سے بھی ہوتی ہے فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا۔ (پھر قسم ہے تدبیر کرنے والے فرشتوں کی حکم کی تعمیل میں) معلوم ہوا کہ فرشتوں کی ایک جماعت امرِ الٰہی کی تدبیر میں مصروف ہے تو ہر فرشتے بھی مختلف سٹاف میں منقسم ہیں باقی مؤکل فرشتوں کا وجود ایک امر کشفی ہے

اسمائے الٰہیہ سے توسل

قرآن پاک میں ارشادِ خداوندی ہے وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (آیت نمبر ۸۰ سورۃ الاعراف - پارہ نمبر ۹) اور اللہ کے ہیں سب نام اچھے سو اس کو پکارو وہی نام لے کر

یعنی اپنی حاجات اللہ تعالیٰ کے اسماء کے ذریعہ مانگو اس آیت کے تحت علامہ سید محمود آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن پاک نے ہم کو توسّل بالاسماء کا حکم دیا ہے توسّل بالاموات کی دعوت نہیں دی۔ احادیث میں بھی قرآنی طریقے توسّل بالاسماء کے مطابق نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم، سے توسّل بالاسماء منقول ہے مثلاً

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ اے اللہ میں تیری پناہ میں آتا ہوں تیری درگزر کرنے بِمُعَافَاتِکَ مِنْ سَخَطِکَ ۔ والی صفت کے ذریعہ تیری ناراضگی سے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بارش نہ ہونے سے قحط پڑا تو صحابہ کرام رضہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو لے کر باہر میدان میں نکلے اور دعا میں یہ بھی کہا کہ اے اللہ ہم پہلے، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آپ سے دعا کرتے تھے آج حضورؐ کے چچا محترم کے ذریعہ دعا کرتے ہیں پھر حضرت عباس رضہ سے کہا گیا کہ آپ دعا کریں ہم آمین کہیں گے[1]

---

[1] مسئلہ توسّل بالمخلوق کی تین تفسیریں ہیں (۱) ایک یہ کہ مخلوق سے دعا اور التجا کرنا جیسا کہ مشرکین کا طریقہ ہے یہ بالاجماع حرام ہے پھر اگر مخلوق کے مؤثر مستقل ہونے کا اعتقاد ہے تو یہ شرک جلی اور کفر صریح ہے اور اگر مؤثر مستقل ہونے کا اعتقاد نہ ہو تو بھی معصیت اور خلافِ نصوص شرعیہ ہونے کی وجہ سے مشابہ بشرک ہے اور اس مشابہت کی وجہ سے اس کو شرعی اطلاقات میں شرک کہہ دیا جاتا ہے (۲) توسل کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ مخلوق سے دعا کی درخواست کرنا یہ صورت ایسے شخص کے حق میں جائز ہے جس سے دعا کی درخواست ممکن ہو توسل کے یہ معنی زندہ شخصیت کے ساتھ خاص ہوں گے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث جو بخاری شریف وغیرہ کتب میں ہے وہاں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دعا کی درخواست ہی کی گئی تھی اور پھر صحابہ کرام کے توسّل بالنّبی کا مطلب بھی یہی ہے کہ بارش کے لئے آپ دعا فرماتے تھے اور صحابہ کرام بھی آپ کے ساتھ دعا میں شریک ہوتے یوں آپؐ صحابہؓ کیلئے وسیلہ بھی ہوتے اور خود بھی دعا فرماتے یہی صورت حضرت عباسؓ سے وسیلہ کی تھی (۳) توسل کی تیسری تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے کسی مقبول مخلوق کی برکت یا اعمال صالحہ کی برکت سے۔ توسّل کی یہ وہ صورت ہے جس کو جمہور امت نے جائز رکھا ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

اس ضمن میں ایک اور واقعہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ جب قحط پڑا تو اماں عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ روضۂ اقدس کے اوپر چھت میں سوراخ کر دو چنانچہ سوراخ کرتے ہی بارش شروع ہو گئی اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق بارش رحمت خداوندی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی رحمت اللعالمین ہیں اس واقعہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اجتہاد فرمایا کہ دو رحمتوں کے درمیان جو پردہ ہے اس کو اٹھا دیا جائے تو دونوں رحمتوں کا اتصال ہو جائے گا اتصال ہوتے ہی بارش شروع ہو جائے گی گویا یہ واقعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی کرامت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ ہوا یہ صورت توسل کی نہ تھی باقی تبرک باعمال صالحین بھی درست ہے اس لئے کعبہ شریف اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر سے جو کپڑا لگ جائے تو وہ متبرک ہو جائے گا۔

اعمال صالحہ کے ذریعہ توسّل

قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق جیسا کہ توسل باسماء الٰہیہ درست ہے جیسا کہ قرآنی آیت وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا اور اللہ کے اچھے اچھے نام ہیں تم ان ناموں کے ذریعہ اس سے مانگو، یوں ہی احادیث کی تصریح کے مطابق توسل بالاعمال بھی جائز اور درست ہے چنانچہ ایک روایت میں ہے

بقیہ حاشیہ ص ۵۵ کا اتباع نے منع کیا ہے جیسا کہ ان کے رسالہ زیارۃ القبور میں ہے۔ جمہور امت کے نزدیک چونکہ یہ وسیلہ احادیث سے ثابت ہے اس لئے جائز ہے جبکہ اس توسل میں نہ مخلوق سے دعا ہے اور نہ التجا بلکہ مقبولیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے سوال ہے جیسا کہ سنن ابن ماجہ میں آپ کا یہ ارشاد ہے کہ میں ان لوگوں کے حق سے سوال کرتا ہوں جو آپ سے سوال کرتے ہیں اور اپنے اس چلنے کے حق سے سوال کرتا ہوں الخ۔

نوٹ: علمی فائدے کے لئے میں نے توسّل کی یہ تفصیل حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی کتاب بوادر النوادر جلد دوم صفحہ ۷۰۶ تا صفحہ ۷۱۱ سے نقل کی ہے۔ تفصیل وہاں ملاحظہ کی جائے خلاصہ میں نے اوپر لکھ دیا ہے۔

(علی اصغر عفی عنہ مرتب)

کہ بنی اسرائیل کے تین آدمی غار میں بیٹھے ہوئے تھے اچانک غار کا منہ بند ہوگیا ان تینوں نے اپنے اپنے اعمال صالحہ کے ذریعہ دعا کی غار کا منہ کھل گیا یہ روایت توسل با عمالِ صالحہ کی دلیل ہے یوں ہی توسل با الا حیاء یعنی زندہ بزرگوں سے دعا کی درخواست کرنا یہ بھی روایات سے ثابت ہے چنانچہ صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بارش نہ ہونے کی شکایت کی تو آپؐ کے دعا فرمانے پر بارش ہوگئی اسی طرح حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں حضرت عباسؓ کو میدان میں لیجاکر دعا کی تو بارش ہوگئی۔

اگر کوئی شخص یوں کہے اَللّٰھُمَّ بِجَاہِ

(مُردوں کو وسیلہ بنانا)

فلاں اور بتوسل فلاں اور بحرمت فلاں (اے اللہ فلاں بزرگ کی جاہ یعنی مقبولیت یا فلاں کے وسیلے یا فلاں کی حرمت کے وسیلے سے میری حاجت پوری فرما) اس کا مطلب یہ ہوا کہ دعا کرنے والا خدا سے ہی مانگ رہا ہے۔ لیکن مقبولین بارگاہِ خداوندی کو اس میں وسیلہ بنا رہا ہے تو صاحب روح المعانی بغدادی حنفی فرماتے ہیں کہ وسیلے کی یہ صورت اس شرط سے جائز ہے۔ کہ جن بزرگوں کو وسیلہ بنایا جا رہا ہے ان کی مقبولیت تواتر سے ثابت ہو جیسے کہ حضرت جنید بغدادی حضرت جیلانی رحمتہ اللہ وغیرہ۔ البتہ توسل با المجہولین یعنی جن کا مقبول عند اللہ ہونا کسی صحیح دلیل سے ثابت نہ ہو ان کا وسیلہ بنانا ناجائز ہے جیسا کہ آج کل عموماً رواج ہے کہ جہاں جھنڈے والی قبر دیکھی اس کو وسیلہ بنالیا (اس صورت میں) فلاں کی حرمت یا عزت کا وسیلہ بنانے کا مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ ان مقبولین کے ساتھ جو تیری محبت ہے اس کو وسیلہ بنا کر آپ سے دعا کرتا ہوں اگر کسی قبر کے نزدیک دعا کی جائے تو دعا کے وقت ہاتھ نہ اٹھائے جائیں۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اس صورت میں منہ بھی قبلہ کی طرف ہو۔ اس لئے کہ سلف صالحین نے قبور کی زیارت فرمائی ہے لیکن ہاتھ نہیں اٹھایا کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ۔ یا السلام علیکم یا اہل القبور (ایمانداروں پہ سلامتی ہو اور اے قبروں والو تم پہ سلامتی ہو) البتہ اگر کبھی کبھار بغیر التزام کے ہاتھ اٹھا

ے تو درست ہوگا ورنہ بدعت ہے۔ اس لئے کہ غیر ثابت شدہ کام کا التزام کرنے کو ہی بدعت کہا جاتا ہے
جیسے دعا بعد از نماز جنازہ کا مسئلہ ہے۔

ابتدائے اسلام میں زیارت قبور سے منع کی حکمت اور زیارت قبور کے فوائد

اسلام کے ابتدائی دور میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو زیارت قبور سے روک دیا تھا
س منع کرنے کی حکمت یہ تھی کہ نئے اسلام لانے والوں کے دلوں میں توحید اسلامی راسخ ہو جائے چنانچہ
یک روایت میں آپ کا ارشاد یوں منقول ہے۔

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ اَلَا فَزُوْرُوْهَا فَاِنَّهَا تُرِقُّ الْقُلُوْبَ وَتُذَكِّرُ الْاٰخِرَةَ۔

میں نے تم کو زیارت قبور سے روکا تھا تو اب زیارت قبور کیا کرو اسلئے کہ اس سے دل نرم ہونے میں
ور آخرت یاد آتی ہے۔ زیارت قبور کے دو فائدے بھی یہاں بتا دیئے گئے ہیں، دلوں کی نرمی
ور آخرت کی یاد اور تیسرا فائدہ اہل قبور کو ایصال ثواب کا ہے لیکن اس کا ذکر یہاں اس لیے نہیں
رمایا کہ ایصال ثواب بغیر زیارت کے بھی ہو سکتا ہے مثلاً گھر میں بیٹھ کر ایصال کر دے زیارت
قبور کے فوائد خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء بھی مؤثر ہیں

قرآن پاک کی آیت کریمہ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا
میں اسمائے الٰہیہ کی تصریح فرمائی ہے اس لئے کہ عبد و معبود کے درمیان واسطہ اسم ہی ہو سکتا ہے
ات و صفات تک بندے کی رسائی نہیں ہو سکتی خوب کہا گیا ہے۔

اے برتر از قیاس و خیال و گمان و وہم
وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم

جب اللہ تعالیٰ کسی کو فیض پہنچانا چاہتے ہیں تو ذات سے صفات میں فیض پہنچ جاتا ہے اور

فیض افعالِ خداوندی کا نام ہے پھر ان فرشتوں کو جو اس صفت کے تحت کام کرتے ہیں حکم دیا جاتا ہے کہ تم منشائے الٰہی کو پورا کرو پھر بندوں تک فیضانِ خداوندی غیبی ذرائع سے پہنچتا ہے۔

خالق اور مخلوق میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ مخلوق کی صرف ذات ہی کار آمد ہوتی ہے۔ صرف اسم کار آمد نہیں ہوتا مثلاً کسی کو صدرِ مملکت سے کام ہو تو اس کے نام کا وظیفہ پڑھنے سے کبھی بھی کام نہیں ہوگا کیونکہ مخلوق میں کام اسم کے بجائے مسمّیٰ سے ہوتا ہے الغرض ممکنات میں اسماء غیر مؤثر ہیں مگر ذات باری تعالیٰ میں اسماء بھی مؤثر ہوتے ہیں، چنانچہ ایک موقعہ پر ارشادِ خداوندی ہے فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (تم مجھے یاد کرو میں تم کو یاد رکھوں گا)

خدا کا یاد کرنا ایسا نہیں جس سے ہمیں کوئی فائدہ نہ پہنچے آیت کی تفسیر بعض حضرات نے یوں کی ہے۔

اُذْكُرُونِي عِنْدَ الْيُسْرِ أَذْكُرْكُمْ عِنْدَ الْعُسْرِ۔ (تم مجھے آسانی کے دور میں یاد رکھو میں تنگی کے دور میں یاد رکھوں گا)

اور بعض نے اُذْكُرُونِي عِنْدَ الْحَاجَةِ أَذْكُرْكُمْ عِنْدَ الْإِجَابَةِ (تم مجھے ضرورت کے وقت یاد کرو میں تم کو قبولیت کے وقت یاد رکھوں گا۔

اسمائے الٰہی سے جسمانی روحانی دونوں فائدے ہوتے ہیں

باری تعالیٰ کے اسماء کا معاملہ مخلوق کے اسماء سے جدا ہے ایک روایت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا منقول ہے

بسم اللہ الذی لا یضر مع اسمہ شیٔ فی الارض ولا فی السماء وھو السمیع العلیم۔ (اس اللہ کے نام سے جس کا نام لینے سے زمین و آسمان کی کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی اور وہ سنتا جانتا ہے)

جس طرح اسمائے خداوندی سے جسمانی فوائد ہوتے ہیں یوں ہی روحانی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں بلکہ جسمانی و روحانی مضرت و نقصان بھی دور ہو جاتے ہیں علاوہ ازیں ذکرِ الٰہی سے دل میں ایک نور در وشنی پیدا ہوتا ہے جس سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا زندگی اب ملی ہے۔ اس

حقیقت کو ایک حدیث شریف میں یوں بیان فرمایا ہے۔

مَثَلُ الْقَلْبِ الَّذِیْ یَذْکُرُ وَمَثَلُ الَّذِیْ لَا یَذْکُرُ کَمَثَلِ الْحَیِّ وَالْمَیِّتِ الحدیث۔ وہ دل جو یادِ الٰہی میں مصروف رہتا ہے اس کی مثال زندہ کی سی ہے اور جو یادِ الٰہی نہیں کرتا اس کی مثال مردہ کی طرح ہے۔

الغرض دلوں کی زندگی تو یادِ خداوندی سے ہی ہے۔

تسمیہ میں تین اسمآءِ خداوندی کے انتخاب کی حکمت

تسمیہ میں اللہ تعالےٰ کے ناموں میں سے تین کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اللہ۔ رحمٰن۔ رحیم۔ پہلے دو یعنی اللہ اور رحمان کا اطلاق بجز ذاتِ خداوندی کسی اور پر جائز نہیں یعنی کسی اور کو اللہ یا رحمان نہیں کہا جا سکتا، ہاں رحیم کا اطلاق دوسروں پر بھی ہوتا ہے مگر اور معنی میں لیکن یاد رہے کہ یہ اطلاق بھی شرع پر موقوف ہے جہاں جہاں شریعت نے کیا ہے ہم بھی کریں گے اور جہاں شریعت نے نہیں کیا وہاں نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ قرآن پاک میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤف رحیم فرمایا گیا ہے جبکہ یہ صفت خداوندِ ذوالجلال کی بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اپنی شان کے مطابق رحمت سے موصوف ہے یعنی رحیم و رؤف ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شانِ رسالت کے مطابق اور اپنی عبدیت کاملہ کے مطابق رؤف الرحیم ہیں باقی تین ہی اسماء کا یہاں کیوں ذکر کیا تو یہاں تسمیہ میں اسمآئے باری تعالیٰ میں سے پہلے اللہ کو لایا گیا ہے خالق کائنات اللہ تعالیٰ ہے چونکہ وجود کے اعتبار سے سب سے پہلے وجود باری تعالیٰ کا ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے۔

كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَعَهٗ شَيْءٌ ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس وقت بھی تھی جبکہ اس کے ساتھ کوئی اور چیز نہ تھی۔

باقی کائنات کا وجود اللہ کے پیدا کرنے سے ہوا (۲) وجود اس کائنات کا اور جو کچھ متعلقات اس میں ہیں جس کو دنیا بھی کہا جاتا ہے نمبر ۳۔ آخرت کا وجود ہے جس کا دور دنیا کے بعد آنے والا ہے

اب ترتیب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو تسمیہ میں بھی پہلے اللہ ہے پھر رحمان اور پھر رحیم اسمآء کی یہ ترتیب ان کے متعلقات کے ترتیب کے لحاظ سے رکھی گئی ہے اللہ کا وجود پہلے تو ذکر بھی پہلے ہے نمبر ۲۔ اسم رحمان ہے جس کا تعلق دنیا کی رحمتوں سے ہے پھر نمبر ۳۔ رحیم ہے اس کا تعلق آخرت کی رحمتوں سے ہے، الغرض ترتیب وجودی کا لحاظ کرتے ہوئے تسمیہ میں اسمآئے الٰہیہ کی ترتیب بھی رکھی گئی ہے یوں ترتیب وجودی اور ترتیب ذکری میں تطابق و توافق ہو گیا۔

تسمیہ میں اسم جلالی ایک اور جمالی دو لانے کی حکمت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں تین اسمآء کا انتخاب فرمایا گیا ہے ان میں اللہ اسم جلالی اور رحمٰن ورحیم اسمآئے جمالیہ ہیں یہاں جلالی اور جمالی اسمآء میں توازن نہیں رکھا گیا شریعت میں غور کرتے سے اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے جیسا کہ صحیحین کی روایت میں ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش سے قبل حق تعالیٰ شانہ نے یہ طے کر رکھا تھا اور اس کو عرش پر لکھا تھا اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ یا غَلَبَتْ غَضَبِیْ۔ (بے شک میری رحمت میری ناراضگی سے آگے ہے یا فرمایا غالب ہے)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں رحمت و غضب دونوں صفات ہیں مگر حدیث قدسی کے مطابق غلبہ صفت رحمت کو ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں رحمت کے غلبے کا اظہار یوں فرمایا ہے کہ اسم جلالی ایک اور اسمآئے جمالی دو لا کر اشارہ یہ فرمایا ہے کہ اللہ جل جلالہ کی رحمت اس کے جلال و غضب سے ڈبل ہے یعنی جو نسبت ایک کو دو سے ہوتی ہے وہ ہی نسبت غضب کو رحمت سے ہے اس بحث سے اسم جلالی ایک اور جمالی دو لانے سے اللہ تعالیٰ کی رحمت و غضب کی نسبت بھی معلوم ہو گئی واقعی اللہ تعالیٰ کی رحمت تکوینیات اور تشریعات دونوں میں غالب اور سابق ہے غور کرنے سے یہ حقیقت بالکل واضح اور صاف ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پیار اور اس کی رحمت کائنات پر بہت زیادہ ہے۔

تکوینیات میں رحمت کا غلبہ

تکوینیات میں رحمت کا غلبہ یوں ہے کہ دنیا میں نعمتیں اور رحمتیں احبّاء اللہ اور اعداء اللہ دونوں میں مشترک ہیں یعنی یہاں کی نعمتیں خدا کے دوست اور دشمن دونوں ہی کے لئے ہیں اور دونوں ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں حالانکہ قانونی تقاضا یہ تھا کہ دوست و دشمن میں فرق رکھا جاتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا بلکہ خدا کے اس عظیم لنگر سے مسلم کافر دونوں ہی کھا رہے ہیں الغرض دنیا کی بہار میں سب شریک ہیں قرآن پاک میں تو ایک موقعہ پر دنیوی مال و دولت کی بے قدری کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

وَلَوْلَا اَنْ یَّکُوْنَ النَّاس اُمَّۃً وَّاحِدَۃً لَجَعَلْنَا لِمَن یَّکفر بالرحمن لِبُیُوْتِھِم سُقُفًا مِن فِضّۃٍ۔ (الآیۃ)

اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ سب لوگ ایک دین پر ہو جائیں تو ہم رحمٰن کے منکروں کو دیدیتے ان گھروں کے واسطے چھت چاندی کی اور سیڑھیاں جن پر چڑھتے اور ان کے گھروں کے دروازوں کیلئے بھی اور تخت بھی جن پر تکیہ لگا کر بیٹھیں بلکہ یہ سب کچھ سونے کے بنا دیتے) یعنی اگر مصلحت مانع نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافروں کے گھروں کی چھتیں۔ زینے۔ دروازے۔ چوکھٹ۔ قفل۔ تخت۔ چوکیاں سب چاندی اور سونے کی بنا دیتا۔

تشریعیات میں رحمت کا غلبہ

تشریعیات میں بھی رحمت خداوندی کا غلبہ ایک حقیقت واقعہ ہے مثلاً،

ت تشریعیات شرع سے نکلا ہے یہاں مراد شرعی احکام ہیں مثلاً جائز نا جائز حلال و حرام۔ ثواب و عذاب فرض واجب سنت مستحب مباح مکروہ حرام وغیرہ غرض یہ ہے کہ شرعی احکام میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کو غلبہ حاصل ہے۔

ل تکوینیات کون سے ہے اور قرآن پاک میں کن فیکون بھی اسی سے ہے ساری مخلوق کو بھی کائنات کہا جاتا ہے یعنی جو اشیاء اللہ تعالیٰ کے حکم کن سے وجود میں آئیں وہ تکوینیات کہلاتی ہیں مثلاً انسانوں کا پیدا کرنا ان کا مارنا ان کو روزی دینا یوں ہی عزت و ذلت اور عروج و زوال کے فیصلے فقر و دولت غلبے اور شکست کے فیصلے ان سب کو تکوینیات کہا جاتا ہے (علی اصغر عفی عنہ)

ایک آدمی سو سالہ عمر کے بعد مسلمان ہوتا ہے اِنَّ الْاِسْلَامَ یَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ (اسلام کے بعد گذشتہ گناہ ختم ہو جاتے ہیں) کے مطابق کفر کے سو سالہ گناہوں کا مٹ جانا، رحمت کے غلبے کی واضح دلیل ہے یوں ہی روایات کے مطابق رمضان المبارک کے روزے اور نماز جمعہ بھی مکفر ذنوب ہے اور پھر سب سے زیادہ واضح بات تو ایک جگہ قرآن پاک میں فرمائی گئی ہے ارشاد ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔

جو کوئی لاتا ہے ایک نیکی تو اس کے لئے اس کا دس گنا ہے اور جو کوئی لاتا ہے ایک برائی سو سزا پائے گا اسی کے برابر اور اُن پر ظلم نہ ہوگا۔

نیکی کا ثواب کم از کم دس گنا اور بدی کی سزا زائد از زائد اس کے برابر تشریعیات میں رحمت کے غلبے اور احسان و انعام کی حد ہے دنیا کے قانون میں اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا ایسی ہی دیگر امثلہ سے قرآن و حدیث کے اوراق بھرے ہوئے ہیں۔ الغرض تشریعی اور تکوینی ہر حیثیت سے غضب کی نسبت رحمت خداوندی سابق اور غالب ہے۔

بسم اللہ قرآنی علوم کی جامع ہے

بقول حضرت حسن بصریؒ حضرت سفیان بن عیینہؒ اور امام سیوطیؒ روایت میں ہے کہ قرآنِ عظیم اوّلین اور آخرین کے علوم کا جامع ہے باقی اوّلین سے مراد حضرت

له قال بعض الشارحين جميع ما فى الكتب المقدمة فى القرآن وجميعه فى الفاتحة وجميعها تحت نقطة الباء منطوية وهى على كل الحقائق والدقائق محطوية ولعله اشار الى نقطة التوحيد الذى عليها مدار سلوك اهل التفريد وقيل جميعها تحت الباء- ووجهه ان المقصود من كل العلوم وصول العبد الى الرب تبارك وتعالى وهذه الباء للالصاق وهى تلصق العبد بجناب الرب تبارك وتعالى وذلك كمال المقصود- ذكره الفخر الرازى وابن نقيب فى تفسيريهما واخرجا عن على رض انه قال لو شئت اوقر سبعين بعيرا من تفسير ام القرآن لفعلت. انتهى مرقات شرح مشكوة ج ۲۔ ص ۱۴۳ تحت حديث الفاتحة اعظم سورة من القرآن (نقله على اصغر عباسى)

ابراہیم علیہ السلام سے قبل یعنی پہلے لوگ اور آخرین سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد والے ہیں اور پھر قرآنِ پاک کے کل علوم سورۂ فاتحہ میں ہیں جبکہ سورہ فاتحہ کے کل علوم بسم اللہ میں ہیں، اور بسم اللہ کے علوم "با" میں ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "با" کے علوم اس نقطے میں ہیں جو "با" کے نیچے ہے اس موقع پر ایک لطیفہ بھی منقول ہے کہ حضرت شبلیؒ سے پوچھا گیا۔ اَنْتَ شِبْلِیْ؟ (آپ شبلی ہیں) جواب میں فرمایا اَنَا نُقْطَۃُ الَّتِیْ تَحْتَ الْبَاءِ ۔
(میں وہ نقطہ ہوں جو "با" کے نیچے ہے) واقعی درست فرمایا۔

اس پر لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اندراج الکثیر فی القلیل خلاف عقل ہے۔ (زیادہ چیز کا اس سے کم میں درج ہونا) آج کل بیسویں صدی میں ہمیں چونکہ مسائیٹر (مسٹر کی جمع) سے پالا پڑتا ہے اس لئے اس کی عقلی وضاحت بھی کرنی ہے تاکہ موجودہ دور کی کھوپڑیوں میں بات آجائے۔ اس کے دو جواب ہیں:

اندراج الکثیر فی القلیل کا جواب

الزامی جواب یہ ہے کہ بے شک آج کل لوگ پہلوں کی نسبت کمزور ہو چکے ہیں لیکن اس کمزوری کے باوجود قرآنِ پاک کے حفاظ ہزاروں لاکھوں تک پہنچتے ہیں ایک بچے کے حافظے میں پورے قرآنِ پاک کا ہونا کیا یہ اندراج الکثیر فی القلیل، نہیں ہے؟ یوں ہی چوتھائی امت کے امام حضرت امام احمدؒ بن حنبل کے متعلق حفظ احادیث کے ضمن میں دو قول ہیں ایک قول کے مطابق ان کو ساڑھے سات لاکھ احادیث یاد تھیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ ان کو دس لاکھ احادیث یاد تھیں اس کی مزید وضاحت یوں سمجھنی مناسب ہوگی کہ بخاری شریف دو جلدوں میں ہے اکثر لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوگی بخاری شریف میں بقول حافظ ابن صلاح با سقاط مکررات چار ہزار دو سو چھتر روایات ہیں۔ جبکہ مکررات سمیت سات ہزار روایات ہیں محفوظات امام احمد بن حنبل اور مرویات بخاری میں

ایک اور سو کی نسبت ہوئی اگر بخاری شریف کی دو جلدوں کو ایک سو سے ضرب دی جائے۔ تو حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی محفوظات روایات کی دو سو جلدیں ہوں گی۔

سوال یہ ہے کہ جو لوگ اندراج الکثیر فی القلیل یعنی تھوڑی چیز میں زیادہ کے اندراج کو خلاف عقل سمجھتے ہیں وہ اس حقیقت واقعہ کو کیا جھٹلا دیں گے کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو دس لاکھ احادیث یاد نہ تھیں؟ یقیناً دو سو جلدوں کے مضامین امام موصوف کے حافظہ میں تھے۔

محل حافظہ کیا ہے؟

یہاں ضمناً یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ حافظے کا مصداق کیا ہے؟ اس کا محل مذاہب سماویہ والے دل کو قرار دیتے ہیں جبکہ یونان اور جدید فلاسفہ حافظے کا محل دماغ کو قرار دیتے ہیں علم تشریح الابدان کے مطابق دماغ چار حصوں میں تقسیم ہوتا ہے وہ یہ ہیں (۱) بطن الیمن (۲) بطن الیسر (۳) اذن الیمن (۴) اذن الیسر۔ ان چاروں ٹکڑوں میں خون کا چکر ہوتا ہے خون کے چکر سے بھاپ نکلتی ہے جسے طبی روح بھی کہا جاتا ہے پھر اس کے ساتھ آسمانی نور بھی ہوتا ہے۔ دماغ اور قلب شریانوں سے آپس میں مربوط ہیں اور بجلی کی طرح رو ہوتی ہے۔ الغرض حافظے کا محل دماغ ہو جیسا کہ فلسفہ جدید والے کہتے ہیں یا قلب ہو جیسا کہ ادیان سماویہ والوں کا خیال ہے۔ ہر صورت میں دماغ کے مغز یا قلب کے لحمی حصہ جو بہت ہی مختصر اور تھوڑا ہے لیکن وہ علوم جو لاکھوں صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں وہ سب حافظہ کے اندر محفوظ ہیں اگر محفوظ نہ ہوں تو بیان کیسے کئے جاتے ہیں؟ یہ اندراج الکثیر فی القلیل (زیادہ کا تھوڑے میں ہونا) کی وہ مثال ہے جس کا تعلق محسوسات سے ہے جب محسوسات میں یہ ممکن ہے تو معنویات میں تو بطریق اولیٰ ممکن ہوگا۔

اندراج الکثیر فی القلیل کا تحقیقی جواب

تحقیقی جواب یہ ہے کہ زیادہ چیز کا تھوڑی چیز میں اندراج کثیف چیزوں میں تو مشکل ہے لیکن لطیف اشیاء میں آسان ہے مگر ہمارا مشاہدہ ہے کہ کثیف چیزوں میں بھی اندراج ہوتا ہے اس کی مثال درختوں کا وجود ہمارے

سامنے ہے مثلاً کھجور کے درخت کی گٹھلی جس کو ہم زمین میں دبا دیتے ہیں وہ گلنے اور سڑنے کے بعد زمین سے اگتی ہے پھر پھولکر بڑھتی ہے پھر اس کا تنہ ظاہر ہوتا ہے پھر شاخیں نکلتی ہیں۔ اور پھر ایک وقت آتا ہے جب یہ گٹھلی ایک تناور درخت بن جاتا ہے اور پھلدار بھی ہوتا ہے اگر اس پورے درخت کو اس کے تنے۔ جڑ۔ شاخوں۔ پتوں۔ پھل اور پھول سمیت وزن کیا جائے تو اس کا وزن منوں میں نہیں بلکہ ٹنوں میں ہوگا۔ لیکن وہ گٹھلی جو اس درخت کی اصل ہے دو ماشہ کی شکل سے ہوگی۔ اب ظاہر بات ہے کہ یہ شجرہ منبسطہ مثمرہ اس نوات میں موجود تھا اور قانون قدرت کے تحت جو چیز اندر تھی اب باہر آگئی ہے۔ قدیم و جدید دونوں فلسفوں کا قانون ہے کہ جو چیز بھی اپنی تفصیلات کے مطابق وجودِ خارجی میں آتی ہے وہ اجمالی وجود کے ساتھ پہلے بھی ہوتی ہے اگر اجمالی وجود پہلے نہ ہو تو تفصیلی وجود کی نوبت نہیں آسکتی اس کی مثال کوئلہ اور لکڑی ہے ان کو جب سلگایا جاتا ہے تو سلگتی ہیں معلوم ہوا کہ پہلے ہی آگ اجمالاً موجود تھی اگر پہلے نہ ہوتی تو لکڑی۔ کوئلہ میں آگ نہ آتی جیسے راکھ میں ایک بار آگ کا وجود ختم ہو جاتا ہے اب راکھ کو سو بار سلگانے سے بھی آگ پیدا نہیں ہوگی جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی کہ راکھ میں اجمالاً بھی آگ نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ گٹھلی اور درخت والی مثال میں دونوں یعنی گٹھلی جو قلیل شئی ہے اور درخت جو کثیر شئی ہے کثیف ہیں جب کثیف چیزوں میں اندراج الکثیر فی القلیل ہو سکتا ہے تو ہماری بحث تو کلام کے متعلق ہے جو لطیف ہے قرآنی مضامین کا اندراج فاتحہ۔ تسمیہ۔ باء اور نقطے میں لطیف ہونے کی وجہ سے کوئی مشکل نہیں ہے۔

کثیر کا قلیل میں اندراج پر امام غزالیؒ کی مثال

حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے ایک اور مثال دی ہے جس کو یہاں استعمال کیا جا سکتا ہے انہوں نے یہ مثال وہاں پیش کی ہے جہاں علم خیالی

اور علم قلبی کی بحث کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ آدمی جب اوپر نگاہ کرتا ہے تو اس کو آسمان، سورج چاند نظر آتے ہیں یہ اشیاء آنکھ کی پتلی سے نظر آتی ہیں جس میں محسوسات کا انتقاش ہوتا ہے یہ پتلی جو آنکھ کا ایک حصّہ اور جزء ہے پوری آنکھ جتنی بھی نہیں بلکہ اقل قلیل ہے لیکن عجائب میں سے ہے کہ یہ انتقاش محسوسات کو قلیل بنا کر نہیں ہوتا مثلاً بلّی کو دیکھا جائے یا اونٹ کو پتلی بہر حال دونوں سے چھوٹی ہے بلکہ بلّی کے ناخنوں سے بھی اس کا جسم چھوٹا ہے مگر دونوں چیزوں کا انتقاش پتلی میں اپنے جسم اور حجم کے مطابق ہوتا ہے اونٹ بڑا اور بلّی چھوٹی نظر آتی ہے ٹیلہ چھوٹا اور پہاڑ بڑا دریا چھوٹا سمندر بڑا نظر آتا ہے یہی حال آسمان، سورج چاند وغیرہ کا ہے کہ وہ اپنے حجم کے مطابق نظر آتے ہیں۔ ٹیلیویژن بھی اسکی ایک مثال ہے۔

قدرت کے عجائبات کی انتہا ہے کہ محلِ انتقاش تو انتہائی چھوٹا اور منتقش بڑا ہونے کے باوجود اپنی بڑائی اور پوری ہیئت کے ساتھ منتقش ہوتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ محلِ انتقاش کے جسم کے مطابق منقّش خواہ بڑا ہو لیکن رائی کے دانے کے برابر بن کر نظر آئے۔ یوں ہی کتب اوّلین و آخرین کے علوم کا اندراج قرآنِ مجید میں ہے اور قرآن مجید کا فاتحہ میں اور فاتحہ کا تسمیہ میں اور تسمیہ کا "با" میں اور "با" کا اس کے نقطے میں اندراج ہے۔ اس مسئلے پر عقلی دلائل بیان کر دیئے گئے ہیں اور امثلہ سے اس کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔

بسم اللہ میں علوم قرآنی کا خلاصہ اور اسکی تشریح

قرآنی علوم کا خلاصہ تین چیزیں ہیں (۱) علم کائنات (۲) علم فوائد دنیویہ (۳) علم فوائد اخرویہ۔ قرآن مجید کو الحمد سے والنّاس تک پڑھ لیا جائے تو انہیں تینوں کا بیان ملے گا۔ علم کائنات عام ہے انسان کی اندرونی حالت بیان ہو جس کو کائناتِ نفسی کہتے ہیں مثلاً قرآن پاک میں جہاں انسانی تخلیق کا ذکر فرمایا گیا ہے جیسے

قُتِلَ الْإِنسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ۝ مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ۝ مِن نُّطْفَةٍ خَلَقَهُ	مارا جائے آدمی کیسا ناشکر ہے کس چیز سے بنایا اس کو ایک بوند سے بنایا اس کو پھر اندازہ پہ

۱

فقدرہ ثم السبیل یسرہ (الآیۃ) رکھا اس کو پھر راہ آسان کردی اسکی

یا پھر آفاقی کائنات کا ذکر ہوگا مثلاً زمین کا آسمان کا پہاڑوں کا یا حیوانات کا ذکر ہے یہ آفاق میں پھیلی ہوئی کائنات ہے یوں ہی دنیوی فوائد کا بھی ذکر ہے مثلاً

خلق لکم ما فی الارض جمیعا یا فرمایا اس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو زمین میں ہے سب کا سب۔ اس نے تمہارے کام میں لگا دیئے

سخر لکم ما فی السموات وما فی الارض۔ جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔) یا پھر فوائد اخرویہ کے علوم ہیں مثلاً حلال و حرام ثواب و عذاب جنت دوزخ کا ذکر کہیں کافروں کی تباہی و بربادی اور مومنین کی کامیابی و کامرانی کا ذکر ہے۔ الغرض یہ تمام مضامین خلاصہ کے طور پر بسم اللہ میں بھی موجود ہیں تسمیہ میں اسم جلالی اللہ (جل جلالہ) سے وجود کائنات متعلق ہے کائناتی نظام سارے کا سارا اسم جلالی کے تحت آتا ہے تو کائناتی علوم لفظ اللہ میں آ گئے خواہ ان کا تعلق نفسی سے ہو یا آفاقی سے اور فوائد دنیویہ کے علوم اسم رحمان میں آ گئے جبکہ فوائد اخرویہ کا تعلق رحیمیت سے ہے تو وہ رحیم میں آ گئے یوں کائناتی علوم دنیا کے فوائد کے علوم اور آخرت کے فوائد کے علوم جو قرآنی مضامین کا خلاصہ ہیں بسم اللہ الرحمن الرحیم میں درج ہیں۔

تمام علوم کا با میں اندراج اور اسکی تشریح

علوم اولین و آخرین کا اندراج

با میں یوں ہے کہ با کا معنی لغت والوں نے الصاق (ملانا) کیا ہے چنانچہ نحو کے امام سیبویہ سے با کے متعلق منقول ہے لم یذکر فی کتابہ الا ھذا المعنی ۔

(اپنی کتاب میں با کا صرف یہی معنی ذکر کیا ہے) تو با کے بنیادی معنی الصاق (ملانا) ہی ہوا باقی معانی اس کی شاخیں ہیں۔ الصاق کا مطلب ارتباط بین الشیئین (دو چیزوں کے درمیان جوڑ) ہوتا ہے اور قرآنی علوم کا خلاصہ ارتباط بین الخالق والمخلوق وارتباط ما بین المخلوق (خالق اور مخلوق کا تعلق اور مخلوقات کا آپس میں ربط و حقوق) گویا اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد

دونوں ہی آ گئے جیسا کہ قرآن پاک میں ایک موقعہ پر آپس میں بندوں کو ایک دوسرے کے حقوق کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ اور پھر — ایک قوم دوسری قوم سے تمسخر نہ کرے اور تم
لَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا۔ الآیۃ — ایک دوسری کی غیبت نہ کیا کرو۔

اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کا آپس میں ربط خراب نہ ہو بلکہ آپس میں جڑے رہیں یوں ہی اپنے خالق و مالک سے ربط قائم رکھنا ایمانی زندگی کی بقا کا سبب ہے اس ربط اور جوڑ کا پیغام، باء الصاق نے دیا۔ الغرض حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کا تحفظ اس میں آ گیا جبکہ قرآنی علوم کا نچوڑ بھی یہی ہے تو بسم اللہ کی باء میں علوم کا اندراج آ گیا۔

علوم قرآنی کا باء کے نقطے میں اندراج اور اس کی تشریح

سب سے زیادہ عجیب بات بظاہر یہ نظر آتی ہے کہ قرآنی علوم کا اندراج باء کے نقطہ میں کیسے ہے؛ اس کی تقریر یوں ہے کہ نقطہ صفر کا نام ہے اور صفر کے معنی "کچھ نہیں" کے ہیں یعنی عدم اور نیست کا ہم معنی ہے مثلاً عرف عام میں کہا جاتا ہے کہ فلاں کو امتحان میں صفر ملا اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کو کامیابی کا کوئی نمبر دیا گیا ہے جس کو صفر کہتے ہیں بلکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس کو صفر ملا ہے وہ امتحان میں فیل ہو گیا ہے ایک نمبر بھی نہیں دیا گیا۔

یہاں ایک اور بات حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی کے حوالے سے نقطے میں علوم کی حقیقت سمجھنے کے لیے معاون ہو گی امام فرماتے ہیں کہ انسان کے اندر گناہ کے تین سرچشمے ہیں (۱) شہوت (چاہت) (۲) غضب (غصہ) (۳) ہوا (خود پسندی) (اس کا مطلب ہے کہ میری کھوپڑی (خیال) کی بات ٹھیک ہے باقی سب غلط) دین اسلام ان تینوں طاقتوں کو خدا کی مرضی میں فنا کر دینا چاہتا ہے تاکہ یہ خدا کی مرضی کے تابع ہو جائیں جیسا کہ ایک حدیث شریف میں ارشاد فرمایا۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ — تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں

...اہ تبعًا لِما جئتُ بہٖ - ہو سکتا جب تک کہ اس کے تصورات وخواہشات
...لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں) اسی کو نقطہ کہا جاتا ہے جو حقیقت میں بقا ہے
...کا جب باقی سے ربط ہو جاتا ہے تو پھر اس کا عدم وجود میں تبدیل ہو جاتا ہے. کل ممکنات
...میں وجودِ حقیقی صرف حق تعالیٰ شانہ کا ہے جب ممکنات کا ربط وجوڑ واجب الوجود ذات سے
...تا ہے تو ممکن موجود ہو جاتا ہے۔ اسی طرح با کے نقطے نے یہ سبق دیا ہے کہ اپنے آپ کو صفر یعنی
...دوم سمجھو لیکن اگر یہ صفر ایک کے پہلو میں آجائے تو دس بن جاتے ہیں پہلے جہاں ایک تھا اب
...دس ہیں الغرض معدوم جو باقی سے جوڑا جائے تو وہ وجود پاتا ہے. تو قرآنِ پاک کے علوم کا
...خلاصہ اور نچوڑ یہ ہے کہ اپنے آپ کو صفر سمجھا جائے اس لحاظ سے علوم اوّلین وآخرین نقطے میں
مندرج ہوئے .

یہاں ایک بات پہ غور

...طریقۂ سنّت کی عظمت اور با کے نقطے میں ایک نکتہ

...جائے تو بدعت وسنت کا فرق بھی واضح ہو جائے گا وہ یوں کہ صفر ایک کے دائیں جانب لگایا
...جائے تو دس بنتا ہے اور اگر بائیں جانب صفر لگا دیا جائے تو کچھ بھی فرق نہیں پڑے گا یوں ہی
...ہم بمنزلہ صفر کے ہیں اگر حق تعالیٰ سے ہمارا جوڑ اور تعلق شریعت اور سنت رسول کے مطابق
...ہوگا تو اس کی دین کی نظر میں قدر و قیمت ہوگی اور اگر سنت کو چھوڑ کر بدعت کا راستہ اختیار کیا جائے
...یعنی اللہ تعالیٰ سے ہمارا ربط اپنا ایجاد کردہ ہو تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی ہندسے کی

...۱۳۷۵ھ مطابق ۱۹۵۵ء کی بات ہے کہ ترمذی شریف کا سبق حضرت استاذ الکل فی الکل مولانا محمد رسول خان
صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ہو رہا تھا دورانِ سبق یہ سوال آیا کہ فرعون جو انا ربکم الاعلیٰ کا مدعی تھا وہ
بنص قرآنی سرکش کافر تھا اسی کا ہم معنی جملہ مشہور صوفی منصور سے اَنَا الحق (میں حق ہوں) منقول ہے
بلکہ بہت سے بزرگ منصور کو اہل اللہ میں شمار کرتے ہیں حضرت الاستاذ نے وجہ فرق اپنے علمی ذوق کے مطابق بیان کرتے ہوئے
فرمایا کہ منصور نے انا الحق کے جملے میں موضوع کو محمول میں فنا کر دیا تھا اس لئے مقبول ہوا اور فرعون نے محمول کو موضوع میں
بند کر دیا تھا اس لئے مردود ہوا (علماء اسکو سمجھ گئے ہونگے. علی اصغر)

بائیں جانب صفر لگا دیا جائے تو یہ کچھ بھی نہیں بنتا اسی طرح سنت کے خلاف اگر خدا سے لگاؤ اور تعلق ہو تو اس کی نہ صرف یہ کہ کوئی قدر و قیمت نہیں بلکہ بنص حدیث مَنْ اَحْدَثَ فِی اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ مردود ہوگا۔

تعوذ و تسمیہ کے نتائج سیاسیہ

اب اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے متعلق یہ بیان ہوگا کہ سیاسی طور پر مسلمانوں کو تعوذ و تسمیہ سے کیا اسباق اور فوائد حاصل ہو سکتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ قسام ازل نے روز اوّل ہی سے انسان میں دو جذبے فطری طور پر ودیعت فرمائے ہیں ایک بغض کا جذبہ ہے جبکہ دوسرا محبت کا جذبہ ہے دونوں جذبے انسان میں موجود ہیں۔ تعوذ میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ بغض کا ہدف و نشانہ درج ذیل تین چیزیں ہونی چاہئیں۔ شیطان۔ اعوانِ شیطان۔ اعمالِ شیطان۔

جذبہ بغض و عداوت کے تین ہدف

اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا یہ ایک کرشمہ ہے کہ انسان میں جہاں بغض و عداوت کا جذبہ رکھا ہے وہاں اس جذبے کا مصرف و محل بھی بتا دیا ہے جذبۂ عداوت کا ہدف تین چیزیں ہیں (۱) شیطان (۲) اعوان شیطان (۳) اعمال شیطان یعنی دشمنی اور بغض کا اظہار تین چیزوں پر ہونا چاہیئے۔ دین اسلام دین فطرت ہے اگر فطری جذبات کے مواقع نہ بتائے جاتے تو انسانی معاشرہ لاعلاج بگاڑ میں مبتلا ہو جاتا اور اسلام کے دین فطرت ہونے پر اعتراض ہو سکتا تھا۔ لیکن اسلام نے اس جذبے کا صحیح مصرف بتا کر اس بگاڑ کا سد باب کر دیا۔

جذبہ عداوت کے مواقع کی ایک مثال

برصغیر کے عظیم اسلامی فلسفی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کو سمجھانے کے لئے ایک عجیب محسوس مثال دی ہے فرماتے ہیں۔ کہ مکان کی چھت پر ایک پرنالہ لگایا جاتا ہے تاکہ بارش کا پانی پرنالے کے ذریعہ باہر چلا جائے اور چھت کے لئے نقصان کا سبب نہ بنے اگر پانی

نکالنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو نتیجہ یہ ہوگا کہ پانی چھت کو خراب کر دے گا پھر چھت ٹپک کر پانی اندرونِ خانہ آجائے گا تو ایسا مکان رہائش کے قابل نہیں رہتا اسی طرح شریعت مطہرہ نے انسانی فطری جذبات کے لئے مواقع اور مصارف بھی بتائے ہیں انسان کی فطرت میں عداوت بغض و غصہ رکھا گیا ہے اگر اس جذبے کے مصارف نہ ہوتے تو اندرونی فساد کی شکل میں ظاہر ہوتا وہ یوں کہ مسلمانوں کا آپس میں جنگ و جدل کا بازار گرم ہو جاتا چنانچہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک قول سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ امیر المؤمنین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کا وجود اس دور میں بہت قیمتی ہے آپ ان کو مسلسل جہاد میں مصروف رکھتے ہیں یوں یہ حضرات تھک جائیں گے ان کو آرام کرنے کا موقعہ دیا جائے تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواباً فرمایا کہ اگر ان حضرات کو جہاد میں مصروف نہ رکھا گیا اور زیادہ آرام کرنے کا موقعہ دیا گیا تو پھر آپس میں لڑنے کا خطرہ ہے اس لئے کہ فطری طور پر قوت غضبیہ تو موجود ہے اگر جہاد کے پیمانے کے ذریعہ اس قوت کو خارج نہ کیا گیا تو آپس میں قتل و غارت میں مبتلا ہو جانا بعید از قیاس نہیں کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آخری دور میں جب فتوحات کا سلسلہ سست پڑا تو فتنوں کے دروازے کھل گئے اور باغی مسلمانوں نے خلیفہ وقت کو بھی شہید کر دیا اور پھر یہ دروازہ آج تک مسلمانوں میں بند نہیں ہوا چنانچہ تاریخ کا ایک عجوبہ یہ نقل کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کا ہر چھٹا خلیفہ مقتول ہوا۔

الغرض قوتِ غضب کو نکالنے کے لئے اسلام نے شیطان، اعوانِ شیطان، اعمالِ شیطانہ مصارف بتائے ہیں اور قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا۔ (بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اس کو دشمن سمجھو) اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں پتہ نہیں کہ تمہارا دشمن کون ہے؟ میں تم کو بتاتا ہوں وہ دشمن بدبخت شیطان ہے تم اپنی ساری غضب کی قوتیں اس کے خلاف

صرف کردو یوں ہی راہِ حق سے بہکانے والے خواہ افراد ہوں یا جماعت اعوانِ شیطان ہیں چنانچہ قرآنِ پاک نے مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ۔ میں انہیں اعوانِ کا ذکر فرمایا ہے پھر کفر و معصیت گناہ کبیرہ و صغیرہ اعمالِ شیطانی ہیں چونکہ یہ شیطان کو محبوب ہیں اور دشمن کی محبوبات سے بغض ہونا عقل کا تقاضا بھی ہے۔

تسمیہ کا سیاسی سبق

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ انسانی فطرت میں غضب کی طرح محبت کا جذبہ بھی رکھا گیا ہے اور پھر اس فطری جذبے کے مصارف اور مواقع بتا دیئے گئے ہیں جس طرح قوتِ غضبیہ کا ھدف تین چیزیں تھیں یوں ہی محبت کے جذبے کا ہدف بھی تین چیزیں ہیں تسمیہ میں اس جذبہ کا مظہر بتا دیا گیا ہے محبت کا اظہار ان تینوں سے ہونا چاہیئے (۱) رحمان (۲) اعوانِ رحمان (۳) اعمالِ رحمانیہ۔ خدائے رحمٰن خود اپنے بندوں سے پیار فرماتے ہیں اسی لئے تو رحمٰن و رحیم اس کی صفات میں سے ہیں اس لئے بندوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے خدائے رحمٰن سے پیار کا اظہار کریں۔ اعوانِ رحمان میں داعیینِ حق آتے ہیں اس لئے جذبہ محبت کا مصرف وہ بھی ہیں اور اعمالِ رحمانیہ سے مراد ظاہر ہے کہ شرعی احکامات ہیں ان کو اپنا کر محبت کا مظاہرہ ہمارا فرض ہے۔

تعوّذ و تسمیہ کا دوسرا سیاسی فائدہ

اعوذ باللہ کا دوسرا سیاسی سبق یہ ہے کہ دشمنوں کی مدافعت اور ان سے بچاؤ کا طریقہ اللہ کی پناہ میں آنا ہے دشمن سے تغافل تباہ کن ہوتا ہے جبکہ تسمیہ سے سیاسی سبق یہ نکلتا ہے کہ مرکزِ محبّت صرف اللہ کی ذات ہو باقی تمام محبّتیں اللہ کی محبت کے تابع ہونی چاہئیں۔ (وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ پ۲ قل ان کان اباؤکم)

استعاذہ اور تسمیہ کا تیسرا سیاسی سبق

اعوذ باللہ اور بسم اللہ سے مشترکہ

سیاسی سبق یہ ملتا ہے کہ تعوذ سے دشمنوں پر غلبہ پانے کی فکر اور تسمیہ سے دوستوں سے حسن سلوک کرنا معلوم ہوتا ہے جس طرح ہر حکومت کے دوست بھی ہوتے ہیں اور دشمن بھی دوستوں کی حوصلہ افزائی اور دشمنوں کی حوصلہ شکنی کسی حکومت کیلئے سیاسی کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے ایک اسلامی معاشرہ کو یہ سبق اعوذ باللہ اور بسم اللہ سے ملا ہے۔

استعاذہ اور تسمیہ کا اخلاقی سبق

اعوذ باللہ میں دفع مضرت ہے یعنی مشکلات میں جائے پناہ صرف اللہ جل جلالہٗ کی ذات ہے جبکہ بسم اللہ میں تحصیل منفعت ہے مطلب یہ ہے کہ دین دنیا کے فوائد کا سہارا بھی صرف ذاتِ رب العلمین ہے اس سے یہ اعتقادی تصور اسلامی معاشرہ میں دیا گیا ہے کہ دفع مضرت اور جلب منفعت دونوں کے لئے سہارا صرف اللہ جل جلالہٗ کی ذات ہے استعاذہ اور تسمیہ دونوں میں بائے استعانت نے اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے مزید برآں قرآن پاک کی دیگر آیات سے بھی صراحتاً اس مضمون کی توثیق ہوتی ہے۔

وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ۔ الآية

اور اگر اللہ تعالیٰ تم کو نقصان پہنچانا چاہیں تو اس کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور دور کرنے والا نہیں ہے

اور دوسری جگہ ارشاد ہے۔

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ۔ الآية

آپ فرما دیجئے کہ میں اپنے آپ کے لئے کسی نفع اور نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں مگر جو اللہ تعالیٰ کی ذات چاہے (وہ ہی ہوتا ہے)

ان آیات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خوف و امید کا مرکز صرف ذات رب العلمین ہے

یہاں ایک سوال اذہان میں آیا کرتا ہے کہ جب نفع و نقصان صرف خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے تو پھر ان اسباب کی کیا حیثیت ہے؟ جو اللہ ہی کے بنائے ہوئے ہیں بلکہ بعض مواقع

پر اسباب کو اختیار کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ اسباب کی حیثیت کو جاننے اور سمجھنے کے لیے درج ذیل مضمون پر غور بصیرت کا سبب ہوگا۔

اسباب کی قسمیں اور ان کی حیثیت

سب سے پہلے ذہن یہ رکھنا ضروری ہے کہ اس جہان میں ہر طرف ہمیں اسباب نظر آتے ہیں یہ اسباب خدا کی پیدا کردہ نعمتیں ہیں جو اس نے اپنے بندوں پر خصوصی انعام فرماتے ہوئے پیدا کیے ہیں، امام غزالیؒ اور دوسرے آئمہ دین نے ان کی تفصیلات بیان کی ہیں چنانچہ اسباب کی کئی قسمیں ہیں ایک قسم اسباب قطعیہّ کی ہے دوسری قسم اسباب ظنّیہ کی ہے اور تیسری قسم کے اسباب کو اسباب وہمیّہ کہا جاتا ہے اس کی تفصیل یوں ہے کہ اسباب قطعیہ میں عام حالات میں اگرچہ تخلف نہیں ہوتا مگر مؤثر حقیقی بہر صورت اللہ تعالیٰ شانہٗ کی ذات ہے مثال کے طور پر بھوک کو دور کرنے کے لیے کھانے کی اشیا اور پیاس کو دور کرنے کے لئے پینے والی چیزیں یہ اسباب قطعیہّ کہلاتی ہیں مگر اثر کی اصل باگ ڈور پھر بھی خدا کے قبضے میں ہے یہی وجہ ہے کہ بعض بیماریوں میں ان اسباب کے استعمال کے باوجود بھوک اور پیاس ختم نہیں ہوتی۔ معلوم ہوا کہ مؤثر حقیقی صرف اللہ ہے ورنہ اس کے خلاف نہ ہوتا۔ دوسری قسم اسباب ظنیہّ کی ہے مثلاً امراض کا علاج۔ علاج معالجہ صحت کا سبب ہے لیکن یہ ایک ظنّی سبب ہے اس لئے کہ علاج سے کبھی صحت ہوتی ہے اور کبھی نہیں بھی ہوتی جیسا کہ ایک حدیث پاک میں ہے حضور کا ارشاد منقول ہے۔

لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ فَإِذَا وَافَقَ الدَّوَاءُ الدَّاءَ بَرِئَ بِإِذْنِ اللهِ ۔

ہر بیماری کی دوا ہے جب علاج بیماری کے مطابق ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے بیمار تندرست ہو جاتا ہے

یونہی اسباب معاش بھی اسباب ظنیہّ میں سے ہیں جیسے تجارت زراعت صنعت و حرفت۔ ملازمت وغیرہ اسباب ظنیہ ہیں یہ اسباب مباح ہیں لیکن ان میں سے کوئی خاص سبب اختیار کرنا ضروری نہیں۔ مثلاً اسباب معاش میں سے کسی ایک سبب کو اختیار کر لینا کافی ہے لیکن ضرورت کے وقت

سباب ظنیہ بھی اسباب واجبہ ہو جاتے ہیں باقی جہاں تک اسباب قطعیہ کا تعلق ہے تو ان کو اختیار رعی حکم کے مطابق واجب اور ضروری ہے مثلاً اگر ایک آدمی کو پیاس لگی ہوئی ہے اور پانی ے ہوئے وہ نہیں پیتا اور یوں اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو وہ گنہگار ہوگا۔ تیسری قسم ب کی اسباب وہمیہ ہیں۔ مثلاً اکتساب الرزق بالکیمیا یا اکتساب الرزق بالسحر (یعنی علم کیمیا یا کے ذریعے رزق کمانا) یہ محض اسباب وہمیہ ہیں شرعی نقطہ نظر سے وہمی اسباب روزی کا نہیں اس لئے شریعت کی نظر میں یہ اسباب ممنوعہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے ں کے لئے یہ اسباب اختیار نہیں فرمائے جبکہ زراعت تجارت اختیار کئے ہیں۔

سلام میں توکّل کی حقیقت

دین اسلام تعطّل اور تسبب کے خلاف ہے جبکہ توکل اسلامی اخلاق ایک اہم خلق ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں توکل کا حکم دیا گیا ہے ارشاد ہے۔

ىَ اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ اور ایمانداروں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا۔

نْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اور جو اللہ پر بھروسہ کریگا تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے کافی ہو جائیں

اللهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ گے بے شک اللہ تعالیٰ اپنے حکم کو آخر تک پہنچانے والے

لِّ شَيْءٍ قَدْرًا۔ ہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کیلئے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے

ں مختصر تشریح یوں سمجھی جاسکے کہ یہاں تین نظریئے ہیں ایک تعطّل ایک تسبب ایک توکل۔ تعطّل کا ی یہ ہے کہ شریعت نے جن اسباب کو اختیار کرنا جائز قرار دیا ہے ان کو بھی ترک کر دیا جائے۔ ترك الاسباب المشروعة۔ تعطّل کا نظریہ گویا حکمت خداوندی کا انکار ہے زراعت و تجارت کو اللہ نے روزی کا سبب بنایا ہے اگر ان اسباب کو بالکل چھوڑ دیا جائے ں سے اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا انکار لازم آئے گا۔ چنانچہ حضرت فاروق اعظمؓ سے منقول فرمایا لوگو! سونا چاندی آسمان سے نہیں برستے تم اپنی ضرورت کیلئے روزی کماؤ یونہی افضل التابعین

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ایک مرتبہ علماء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ اکتسبوا الرزق ولا تکونوا کلًّا علی النّاس۔ اب تو کچھ لوگ تعطّل کو توکل کا نام دیتے ہیں جبکہ اسلام نے توکل کا تو حکم دیا ہے تعطّل یعنی جائز اسباب کو بھی اختیار نہ کرنے کو پسند نہیں کیا گیا۔

بعض لوگ تعطّل کے لئے ایک حدیث پیش کرتے ہیں جو امام احمد سے منقول ہے اس کے عربی الفاظ یوں ہیں۔

لو توکلتم علی اللہ توکلا لرزقکم اللہ کما یرزق طیرًا تغدوا خماصًا وتروح بطانًا اَوْ کما قال علیہ السلام۔

اگر تم اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا پورا بھروسہ رکھو تو تم کو اللہ اسی طرح رزق عطا فرمائیگا جسطرح پرندوں کو رزق عطا فرماتا ہے وہ صبح کو خالی پیٹ جاتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ واپس آتے ہیں۔

اس حدیث کو تعطّل کے لئے پیش کرنا غلو کے سوا کچھ نہیں کیونکہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو وہ تم کو بھی ویسے ہی روزی دے گا جیسے پرندوں کو دیتا ہے کہ یہ پرندے صبح کو خالی پیٹ جاتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ لوٹتے ہیں غور کیجئے کہ حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم کو اللہ ویسے ہی روزی دے گا جیسے پرندوں کو گھونسلوں میں بیٹھے بٹھائے دیتا ہے بلکہ پرندوں کی تشبیہہ دیتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ ان پرندوں کو اللہ ہی روزی دیتا ہے جبکہ پرندے صبح کو تلاش روزی میں نکلتے ہیں تو پرندوں کا صبح کے وقت نکلنا کوئی ڈاک پہنچانے اور سبق پڑھانے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ روزی کی تلاش میں یہ صبح کو نکلتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو روزی عطا فرما دیتا ہے اس حدیث میں تعطّل کے خلاف بات نکل آئی کہ تم بھی پرندوں کی طرح محنت کرو اللہ تعالیٰ تم کو بھی دے گا۔ دوسری چیز تسبّب ہے کہ آدمی اسباب کو ہی مؤثر سمجھے جیسا کہ آج کل یورپ میں یا مغرب زدہ طبقے کا مذہب ہے کہ یہ لوگ اللہ کی ذات کو جو مؤثر حقیقی ہے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ پیٹ کی بنیاد پر اس وقت پوری دنیا دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی ہے اسلام کا راستہ صراط مستقیم ہے یعنی اسلام کے نزدیک تعطّل کا نظریہ بھی غلط ہے اور مادہ پرستوں کے تسبّب

کا نظریہ بھی غلط بلکہ صحیح کی راہ اسلام کے نزدیک وہ ہے جس کو توکل کہا گیا قرآن اور حدیث کی روشنی میں توکل کا معنیٰ یہ ہے کہ اسباب مشروعہ کو اختیار کرتے ہوئے خدا کو مؤثر حقیقی جانا جائے چنانچہ دانائے روم نے اس حقیقت کو ایک شعر میں بیان کیا ہے۔

گفت پیغمبر بآواز بلند   بر توکل زانوئے اشتر ببند

یعنی پہلے اونٹ کے گھٹنے باندھو اور پھر توکل کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو نہیں بھاگنے دے گا۔ اسباب مشروعہ کو ترک کرنا توکل نہیں ہے یہ صورت تو تعطل کی ہو جائے گی جو غیر شرعی ہے۔

صوفیائے کرام اور توکّل

بعض صوفیاء کے کلام میں کچھ ایسی باتیں آ جاتی ہیں جن کو نہ سمجھنے کی وجہ سے توکل اور تعطل میں اشتباہ ہو جاتا ہے مثلاً صوفیاء یہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر کامل یقین ہو تو اسباب مشروعہ کو بھی ترک کیا جا سکتا ہے لیکن یہ خالص صوفیانہ بات ہے اس میں ترک اسباب نہیں بلکہ اسباب کی دو قسمیں ہوتی ہیں کبھی اسباب روحانی ہوتے ہیں اور کبھی اسباب مادّی ہوتے ہیں۔ صوفیائے کرام روحانی اسباب کو اختیار کرتے ہیں جیسا کہ ایک واقعہ ہے کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے جب آپ کانپور میں مدرس تھے تو اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کو خط لکھا کہ سلوک کے ضمن میں مدرسی چھوڑ دوں؟ تو حضرت حاجی صاحب نے جواب میں لکھا کہ پہلے اپنے دل کو ٹٹولو اگر ملازمت ترک کرنے میں قلب کا اطمینان میسر ہو تو بے شک ملازمت ترک کر دو اور اگر قلب کا اطمینان پہلے کی طرح نہ ہو تو ملازمت ترک کرو۔ اس لئے کہ ایسی صورت میں ترک ملازمت خطرناک ہوگا یاد رہے کہ یہ باتیں خواص کی ہیں عوام کو ان باتوں میں نہیں الجھنا چاہیئے حضرت تھانوی کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ کانپور میں ایک معمّر حکیم صاحب تھے جو مسافروں کی خبر گیری کرتے رہتے تھے چنانچہ ایک بار شام کو مسجد میں آکر پوچھا کہ بھائی کوئی مسافر ہے؟ ایک آدمی نے کہا کہ میں ہوں۔ حکیم صاحب نے پوچھا کہ روٹی کھاؤ گے مسافر نے کہا روٹی کھاتی تو ہے مگر آپ کیا کھلائیں گے؟ حکیم صاحب نے فرمایا

دال روٹی جو ہو گی مسافر نے کہا میں دال روٹی نہیں کھاتا تو حکیم صاحب گھر چلے گئے اتفاق سے اس دن کسی شادی میں حکیم صاحب مدعو تھے مگر کسی وجہ سے دعوت میں نہیں جا سکے تو شادی کے گھر والوں نے ان کے حصے کا کھانا بھجوایا کھانا لے کر جو آدمی حکیم صاحب کے پاس گیا تو حکیم صاحب نے پوچھا کیا لائے ہو؟ اس نے کہا مرغ پلاؤ حکیم صاحب نے فرمایا یہ مرغ پلاؤ میرا نہیں ہے بلکہ اس مسافر کا ہے جو مسجد میں بیٹھا ہے۔ چنانچہ مرغ پلاؤ مسافر کے پاس بھیج دیا گیا۔ لعد میں مسافر نے بتایا کہ میں نے دل میں طے کر لیا تھا کہ اے اللہ بھوک میں اگر مر بھی جاؤں تو آپ کی مرضی ہے مگر کھانا کھاؤں گا تو مرغ پلاؤ ہی کھاؤں گا چنانچہ جس دن سے یہ عہد کیا تھا اس وقت سے مرغ پلاؤ ہی مل رہا ہے یہ کامل یقین کی مثال ہے قانونِ عام نہیں ہے۔

تو صوفیائے کرام کے ہاں کبھی کبھار جو اسباب کو ترک کر دیا جاتا ہے حقیقت میں یہ اسباب کا ترک کرنا نہیں ہوتا بلکہ مادی اسباب کی بجائے روحانی اسباب کو یہ حضرات اختیار کرتے ہیں جو ہر کس و ناکس کے لیے قابلِ تقلید نہیں۔

(بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا بیان ختم ہوا)

(والحمد للہ اولاً وآخراً)

آگے سورۃ فاتحہ کی تفسیر شروع کی جاتی ہے:-

سُورۃ فاتحہ کی لُغوی تفسیر

حلِ لغات | اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الآیۃ

حَمِدَ۔ حَمْدًا۔ یَحْمَدُ حَمْدًا وَ مَحْمَدَۃً باب سمع یسمع سے آتا ہے۔ حمد کی تعریف علامہ تفتازانی رح نے یوں کی ہے :۔

هو الثناءُ باللسانِ علی الجميل الاختياری سواء تعلق بالفواضِل اوِ الکمالات ۔

حمد اس ثنا کا نام ہے جو زبان کے ذریعہ کسی اچھے اختیاری فعل پر کی جاتی ہے خواہ اس کا تعلق فضائل سے ہو یا کمالات سے ہو۔

ہمارے نزدیک مناسب اور مختصر ترین حمد کی تعریف یہ ہے ھُوَ بیانُ کمالات المختار (یعنی صاحب اختیار ذات کے کمالات کو بیان کرنا) اللہ تعالیٰ کی ذات چونکہ صاحب اختیار ہے۔ بلکہ صفات خداوندی اس کے لوازم میں سے ہیں اس لئے اختیاری کی قید لگانے کی ضرورت نہیں اور لسان کی قید کی ضرورت اس لئے نہیں کہ بیان زبان سے ہی ہوتا ہے اور لفظ جمیل کی ضرورت اس لئے نہیں کہ تعریف میں کمالات کا لفظ جمیل کو شامل ہے۔ رَبِّ الْعَالَمِیْن ۔ لفظ ربّ کے متعلق علماء کی تین آراء ہیں (۱) مصدر ہے۔ (۲) صفت مشبہ ہے۔ (۳) اسم فاعل ہے۔ ربّاً مصدر کہا جائے تو اس کا اطلاق مبالغتاً[1] ہوگا جیسے زیدٌ عدلٌ میں عدل کا حمل زید پر مبالغتاً ہے۔ صفت مشبہ والا قول درست نہیں تیسرا قول کہ اسم فاعل ہے راجح ہے سید محمودؒ آلوسی صاحب روح المعانی کے نزدیک بھی یہی قول مختار ہے اسم فاعل کی صورت میں ربّ کی اصل رابٌ ہو گی

[1] مبالغتاً کا معنی زیدٌ عدلٌ کی مثال میں یہ ہے کہ زید سراپا عدل و انصاف ہے یوں ہی ربّ کے معنی تربیت کرنے والے کے ہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات سراپا تربیت ہے۔ (علی اصغر عفی عنہ ، مرتّب)

الف تخفیفاً حذف کر دیا گیا اور با کو با میں ادغام کر دیا تو ربٌّ ہو گیا۔ امام النحاۃ ابو حیان نے بحر المحیط میں بھی لکھا ہے کہ یہی قول بہتر ہے۔

وَیُؤَیِّدُہٗ اِضَافَتُہٗ اِلَی الْمَفْعُوْلِ وَالصِّفَۃُ الْمُشَبَّہَۃُ لَا یُضَافُ اِلَّا اِلَی الْفَاعِلِ۔ اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس کی اضافت مفعول کی طرف ہو رہی ہے جبکہ صفت مشبہ صرف فاعل ہی کی طرف مضاف ہوتا ہے۔

تربیت کی تعریف

چونکہ ربّ کے معنی تربیت کرنے والے کے ہیں تو تربیت کی تعریف بھی معلوم ہونی چاہیئے۔ وہ یہ ہے۔

اِبْلَاغُ الشَّیْئِ اِلٰی کَمَالِہٖ بِحَسْبِ اِسْتِعْدَادِہٖ شَیْئًا فَشَیْئًا۔ کسی چیز کو اس کی استعداد کے مطابق آہستہ آہستہ حد کمال تک پہنچانا۔

استعداد کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر ایک کو اس کی قابلیت کے مطابق کامل بنا دیا جائے مثلاً انسان کو اس کی قابلیت کے مطابق اور جانوروں کو ان کی قابلیت کے مطابق اور حشرات الارض کو ان کی قابلیت کے مطابق کامل بنانا ربوبیت کی یہ شان صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے جو نہ صرف زمینی اشیاء سے متعلق ہے بلکہ عالم بالا، سمندروں اور پھر ارحام اُمہات میں بھی (جہاں بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کا کنٹرول نہیں) تربیت خداوندی ہی کارفرما ہے۔

اَلْعَالَمِیْنَ عالَم کی جمع ہے۔ عالم کا لغوی معنی مَا یُعْلَمُ بِہِ الشَّیْئُ۔ ہے (عالم کا معنی جس سے کسی چیز کا علم ہو) جیسے خاتم کا معنی مَا یُخْتَمُ بِہٖ (جیسے خاتم کا معنی مہر لگانے کا آلہ) عرف میں عالم کا معنی ہوگا مَا یُعْلَمُ بِہِ الصَّانِعُ۔ (یہاں عالم کا معنی جس سے جہان بنانے والے کے متعلق معلومات حاصل ہوں) عرفی معنی میں تخصیص ہے جبکہ لغوی معنی میں تعمیم تھی۔ (عمومیت) جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ واؤ نون کے ساتھ جو جمع عربی میں آتی ہے وہ عقلاء سے مختص ہوتی ہے جبکہ عالم عقلاء اور غیر عقلاء کے

وعہ کا نام ہے اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ عالم میں انس و جن۔ فرشتے عقلاء ہیں لیکن صحیح ترین بات
یہ ہے کہ یہاں واؤ نون کے ساتھ جمع تغلیباً لائی گئی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ جیسے عقلاء کے رب ہیں
یسے ہی غیر عقلاء کے رب بھی ہیں اور عربی زبان میں اس طرح ہوتا رہتا ہے جیسے سورج و چاند دونوں
شمسین اور کبھی قمرین تغلیباً ہی کہا جاتا ہے۔ یوں ہی اس کائنات میں غیر عقلاء کو عقلاء کے تابع
انتے ہوئے تغلیباً جمع لائی گئی ہے۔

الرحمٰن الرحیم کی لغوی تحقیق

یہ دونوں صفاتی نام ہیں ان دونوں کے متعلق دو قول ہیں

یہ ہے کہ رحمٰن رحیم دونوں صفت مشبّہ کے صیغے ہیں اس پر یہ سوال کیا گیا ہے کہ صفت مشبّہ
زمی فعل سے آتا ہے متعدی فعل سے صفت مشبّہ نہیں آتا جبکہ یہ دونوں متعدی ہیں جیسے کہا
تا ہے رحمہ اللہ (اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے) اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ رَحِمَ متعدی کو نقل
کرکے رَحُمَ میں لایا گیا اور رَحُمَ باب لازمی ہے اس سے صفت مشبّہ آتا ہے۔ یعنی باب متعدی
سے باب لازمی کی طرف انتقال کی کاروائی کی گئی ہے۔ اس لئے وہ سوال جاتا رہا ہے۔ دوسرا
قول یہ ہے کہ رحمٰن فَعلان کے وزن پر اور رحیم فعیل کے وزن پر دونوں مبالغے کے صیغے ہیں۔
بہرحال دونوں کا مادہ رحمت ہے اردو ترجمہ بہت رحم کرنے والا ہوگا۔

رحمت کی تعریف اور مفسّرین کرام

رحمت کسے کہتے ہیں؟ قاضی بیضاویؒ اور امام رازیؒ نے علّامہ زمخشری کی
تقلید میں رحمت کی تعریف یوں فرمائی ہے رِقَّةُ الْقَلْبِ بِحَيْثُ يَقْتَضِي الْاِحْسَان۔
(یعنی دل کا اس طور پر نرم ہونا کہ اس نرمی سے احسان کرنے کی طرف میلان ہو جائے) اس تعریف
پر مشہور اعتراض ہے کہ اللہ تعالیٰ تو قلب اور دیگر جسمانیات سے پاک ہے؟ اس لئے جواب
یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ میں رحمت کا یہ معنی بطور مجاز کے مراد ہوگا امام بیضاویؒ۔ رازیؒ۔ زمخشریؒ
تینوں بزرگوں نے یوں کہا ہے کہ یہاں مبدأ نہیں بلکہ غایت مراد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ رقت

قلب کا جو ثمرہ اور نتیجہ ہے یعنی احسان کرنا یہاں اس پر رحمت کا اطلاق ہوا ہے اور رحمت کا یہ معنی حقیقی نہیں بلکہ مجازی ہے۔ میرے نزدیک یہ رائے درست نہیں اس لئے کہ پھر اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ مجازی معنی میں رحمٰن ورحیم ہے حقیقی معنی میں نہیں ہے (العیاذ باللہ) بات یہ ہے کہ مدلول مجازی سے مدلول حقیقی کی نفی درست اور صحیح ہوتی ہے مثال کے طور پر شیر ایک درندہ ہے اور یہ اس کا حقیقی معنی ہے عرف عام میں ایک بہادر انسان کو بھی شیر کہہ دیا کرتے ہیں اب اگر مجازی معنی کی نفی کرتے ہوئے یوں کہا جائے کہ بہادر آدمی شیر نہیں تو یہ بالکل درست ہوگا۔ کہ اصل حقیقت میں تو شیر ایک درندے کا نام ہے نہ کہ آدمی کا آدمی کو تو مجازاً بہادری کی وجہ سے شیر کہہ دیا جاتا ہے یوں ہی بالکل ایسی خرابی یہاں بھی لازم آئے گی کہ رحمت کے اگر مجازی معنی لئے جائیں تو رحمت کی نفی اللہ تعالیٰ سے بھی درست ہو جائے حالانکہ ایسا جائز نہیں اس لئے یہ قول غلط ہے۔

حضرت افغانی رح کی تحقیق

رحمت کا وہ معنی جس پر اعتراض نہ ہو

میرے نزدیک رحمت کی ایسی تعریف ہونی چاہیئے جس پر دینی روشنی میں اعتراض نہ ہو سکے اب تطبیق ہمارے نزدیک یوں ہے۔ کہ ان بزرگوں نے تعریف رحمت مطلقہ کی نہیں کی بلکہ ان حضرات نے انسانی یا حیوانی رحمت کی تعریف کی ہے اسی لئے تعریف میں قلب کا لفظ آئے ہیں اور انسان یا حیوان تو قلب سے پاک نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے خیال میں مطلق رحمت کی مناسب ترین تعریف جس پر اشکال نہ پڑتا ہو۔ یہ ہے۔ اِيصَالُ النَّفْعِ سَوَاءٌ كَانَ بِرِقَّةِ الْقَلْبِ أَوْ بِالْإِرَادَةِ ۔

(نفع پہنچانا خواہ یہ دل کی نرمی سے ہو یا ارادے سے ہو' رقت قلب سے رحمت کا صدور حیوانات اور انسانوں سے مختص ہے جبکہ ارادہ سے رحمت کا صدور اللہ تعالیٰ کی ذات سے مختص ہوگا۔

اب مشہور قلب کے اطلاق والا اعتراض جاتا رہا۔ (وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ عَلٰی ذٰلِکَ)

مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ : (یعنی بدلے کے دن کا مالک) یوم کا اطلاق دو معنوں

پڑتا ہے ایک عرفی دوم شرعی عرفی معنی کے لحاظ سے یوم کا اطلاق مِنْ طُلُوْعِ الشَّمْسِ اِلٰی غُرُوْبِہَا (صبح سورج نکلنے سے غروب آفتاب تک) پر ہوتا ہے اور شرعی حیثیت سے یوم کا اطلاق مِنْ طُلُوْعِ الْفَجْرِ اِلٰی غُرُوْبِ الشَّمْسِ (صبح صادق سے سورج ڈوبنے تک) پر ہوتا ہے اور کبھی یوم کا اطلاق بغیر تخصیص طلوع و غروب کے مطلق وقت پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک موقعہ پر فرمایا۔

یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ ۔ الآیۃ
جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی اور آسمان سے بدل دیا جائیگا (حقانی)

اس لئے کہ جب یہ زمین و آسمان بدل جائیں گے اس وقت نہ طلوع ہوگا نہ غروب۔

الدِّین : اس کے ایک معنی جزا اور بدلے کے ہیں جیسے کہ عربی مقولہ ہے۔

کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ
جیسے کرو گے ویسے بھرو گے (دیا) ہم نے ان کو

دِنّٰہُمْ کَمَا دَانُوْا ۔
بدلا دیا جیسے انہوں نے ہمیں دیا۔

دین کے ایک معنی شریعت کے بھی ہیں، اور شریعت سے مراد شرعی قانون ہے ایک موقعہ پر ارشاد خداوندی ہے: (سورۂ آلِ عمران آیت نمبر ۱۹)

"اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ"
یقیناً سچا دین اللہ کے ہاں اسلام ہے۔

اس آیت میں دین سے مراد شریعت ہے، سورۂ فاتحہ میں یوم الدین (بدلے کے دن کا مالک) سے مراد جزا اور بدلہ ہے۔ نَعْبُدُ عبادت سے ماخوذ ہے اور عبادت کا معنی قاضی بیضاویؒ نے کئے ہیں۔ اَقْصٰی غَایَۃِ التَّذَلُّلِ۔ (انتہائی درجے کی انکساری اور ذلت اختیار کرنے کو عبادت کہتے ہیں) امام راغبؒ جو علامہ بیضاویؒ کے استاد ہیں انہوں نے عبادت کی تعریف یوں کی ہے اَقْصٰی غَایَۃِ التَّعْظِیْمِ۔ (یعنی انتہائی درجے کی تعظیم کا نام عبادت ہے)

بظاہر دونوں تعریفوں میں تضاد نظر آتا ہے لیکن ہمارے نزدیک کوئی تضاد نہیں ہے اس لئے

کہ عبادت ایک نسبت عبد و معبود کے درمیان ہے اور نسبت کو جانبین سے تعلق ہوتا ہے تو عبادت ہم کو عبد و معبود دونوں سے تعلق ہے عبد کے اعتبار سے عبادت آخری درجے کی انکساری اور ذلت کا نام ہے جبکہ معبود کے اعتبار سے عبادت ایک انتہائی عظمت کا نام ہے۔ اصل معنی کے اعتبار سے عبادت افعالِ قلوب میں سے ہے جبکہ نماز روزہ وغیرہ عبادت کا مظہر اور قوالب ہیں۔

شریعت کی نظر میں عبادات کی روح اور صورت دونوں ہی مطلوب ہیں

شریعت نے ان مظاہر کو اصل کا حکم دیا ہے یعنی روح تو قلبی عبادت ہے اور صورت یہ نماز روزہ ہیں شریعت کی نظر میں روح اور صورت یعنی ظاہر اور مظہر دونوں ہی مطلوب ہیں جیسا کہ دنیا میں ہر چیز کی صورت اور روح دونوں مطلوب ہوتے ہیں اس لئے اگر کوئی شخص اپنی انتہائی ذلت و انکساری اور خدا کی انتہائی عظمت کا تصور دس لاکھ سال تک بھی کرتا رہے تو یہ قلبی تصور ایک نماز کے برابر بھی نہیں ہوگا شریعت کا حکم ہے کہ خدائی عظمت کو نماز روزہ کے قالب میں ظاہر کرو عبادت کا قالب اور اس کی شکل بھی اللہ تعالیٰ نے بنا دی ہے ہم اپنی طرف سے کوئی اور قالب اور شکل نہیں بنا سکتے اس مسئلے کی ایک اور مثال قربانی ہے جو ایک عبادت ہے اگر ایام مخصوصہ میں ایک بکری وغیرہ حسب الحکم ذبح نہ کی جائے جس کی قیمت فرض کرو پانچ صد یا ایک ہزار روپیہ ہے تو پانچ لاکھ یا دس لاکھ بھی اس کا بدل نہیں ہو سکتا اس لئے کہ شریعت میں روح اور صورت دونوں ہی مطلوب ہیں اس کی ایک عام فہم مثال سے یوں وضاحت ہو سکتی ہے کہ دنیا کی ہر حکومت میں یہ قانون ہے کہ روح اور صورت دونوں ہی ضروری ہوتے ہیں مثال کے طور پر کسی نے ایک لاکھ روپے کی زمین یا کوئی جائداد خریدنی ہو تو رقم کے مطابق ایک خاص قیمت کا اسٹامپ یا ٹکٹ خریدنے ہوتے ہیں فرض کیجئے کہ ایک آدمی نے اسٹامپ یا ٹکٹ ایک سو روپے کے خریدنے تھے اس نے بجائے اسٹامپ یا ٹکٹ کے ایک سادے کاغذ پر سو کے بجائے ایک سو بیس روپے کے کرنسی نوٹ چسپاں کر دیئے تو کیا کوئی عدالت اس کو تسلیم کرے گی؟ حالانکہ اسٹامپ کی روح تو کرنسی نوٹوں کی شکل میں موجود ہے لیکن حکومتی قانون میں جس شکل و صورت اور قالب

کی ضرورت تھی اس کے نہ ہونے سے عدالت صرف سادے کاغذ پر لگے ہوئے کرنسی نوٹوں کو تسلیم نہیں کرتی حالانکہ اسٹامپ کی روح موجود ہے ہاں صورت موجود نہیں جبکہ مطلوب دونوں ہیں۔ یوں ہی خدائی قانون میں بھی روح کے ساتھ شکل و صورت اور قالب لازمی ہے ورنہ خدائی عدالت میں صرف قلبی عبادت مقبول نہ ہوگی۔

نَسْتَعِیْن استعانت سے ماخوذ ہے استعانت کا استعمال دو مقام پہ ہوتا ہے۔ (۱) مَا یَتَمَکَّنُ بِهٖ عَلَى الْفِعْل (جس سے کام پر قدرت ہو سکے) (۲) مَا یَتَیَسَّرُ بِهِ الْفِعْل۔ (جس سے فعل آسان ہو) استعانت اس سامان کا نام ہے۔ جس کے بغیر کام نہ ہو سکے یا جس کے ذریعہ کام آسان ہو جائے۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ اسباب تمکین اور اسباب تیسیر دونوں ہی خدائی اختیار میں ہیں اسی لئے دونوں جگہ یعنی نعبد اور نستعین میں (فعل و فاعل) سے مفعول کی تقدیم حصر ظاہر کرنے کے لئے کی گئی ہے۔ یعنی تیری ہی بندگی کرتے ہیں الخ۔

"اهدنا الصراط المستقیم" ہدایت کے معنی میں اربابِ منطق نے کچھ زیادہ ہی زور بڑکی ہے ہم آسانی کے ساتھ اختصاراً بیان کریں گے۔

ہدایت کے معنی

ہدایت کے دو معنی آتے ہیں۔ پہلا معنی (۱) اَلدَّلَالَةُ الْمُوْصِلَةُ اِلَى الْمَطْلُوْب۔ (ایسی دلالت جو مطلوب تک پہنچا دے) (۲) دوسرا معنی اَلدَّلَالَةُ عَلٰى مَا یُوْصِلُ اِلَى الْمَطْلُوْب (ایسی دلالت جو مطلوب تک پہنچانے کا ذریعہ بنے) دونوں معنوں کو آسانی سے سمجھنے کے لئے ایک مثال سن لی جائے مثلاً شہری زندگی کے لحاظ سے ایک آدمی سٹیشن کا پتہ پوچھتا ہے۔ تو اس کو ساتھ لے کر عین سٹیشن پر پہنچا دیا جائے تو یہ قسم اوّل ہے اسی کو دلالتِ موصلہ کہا جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ پوچھنے والے کو صرف سٹیشن کا راستہ بتا دیا جائے پہلی صورت میں وصول ضروری ہے جب ہاتھ پکڑ کر منزل پر کسی کو پہنچا دیا گیا تو لازماً وہ پہنچ گیا لیکن دوسری صورت میں، وصول ضروری نہیں راستے میں گم ہونے کا خطرہ بھی ہے۔ یہ دونوں ہدایت کے معنی قرآن پاک

سے بھی ثابت ہیں مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ آپ کے چچا ابو طالب ایمان قبول کر لیں اور حسب بیان مفسرین و روایات آپ نے ان کے لئے دعا بھی فرمادی تھی لیکن قرآنِ پاک کی ایک آیت اس کے جواب میں نازل ہوئی فرمایا۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ الآیۃ (آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ پسند فرمائیں لیکن اللہ تعالیٰ جسکو چاہتا ہے ہدایت سے سرفراز فرماتا ہے)

ظاہر بات ہے کہ یہاں إِرَاءَةُ الطَّرِيق (صرف راستہ بتانا) مراد نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ہر نبی و رسول ہادی (یعنی راستہ بتانے والا) ہوتا ہے اور ہمارے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم تو ہادی اعظم ہیں قرآن پاک میں ایک مقام پر آپ کی اس شان کو یوں بیان فرمایا ہے۔

وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (اور بے شک آپ سیدھے راستے کی رہنمائی فرماتے ہیں) تو لَا تَهْدِي میں اس معنی کی نفی نہیں ہو سکتی بلکہ یہاں ہدایت کا دوسرا معنی ایصال الی المطلوب (منزل تک پہنچانا) مراد ہے جس کی نفی آیت میں فرمائی ہے۔ باقی سورۃ فاتحہ میں جس ہدایت کی درخواست کی گئی ہے وہ بھی ایصال الی المطلوب یعنی ہدایت کا پہلا معنی ہی مراد ہے۔ قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی ہدایت کو حضرات انبیاء علیہم السلام یا ان کے نائبین کا فریضہ قرار دیا گیا ہے وہاں ہدایت کے معنی اِرَاءَةُ الطَّرِيق۔ یعنی راستہ بتانے کے ہی مراد ہوں گے۔ اور جہاں نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو گی وہاں منزل مقصود تک پہنچانا مراد ہوگا

صراط: اصل میں سین سے سراط تھا چونکہ عربی زبان میں س۔ اور ص۔ دونوں کا آپس میں تبادلہ ہو سکتا ہے اس لئے معنی میں کوئی فرق نہ ہوگا یہ لفظ سَرَطَ الطَّعَامَ اِذَا ابْتَلَعَهٗ سے ماخوذ ہے (یعنی جب کھانا حلق سے اتار کر نگل لیا تو عرب کہتے ہیں سرط الطعام) راستے کو صراط یا سراط اس لئے کہا جاتا ہے کہ راستے پہ چلنے والا جب سڑک پہ چل رہا ہوتا ہے تو گویا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے نوالہ حلق میں جا رہا ہو۔

المستقیم: استقامت سے ماخوذ ہے اور استقامت (سیدھا) اعوجاج

(ٹیڑھاپن) کی ضد ہے اعوجاج کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) اعوجاجِ ذاتی۔ (۲) اعوجاجِ اضافی۔ ذاتی اعوجاج یہ ہے کہ کسی چیز میں اپنی ذات کے اعتبار سے کجی ہو مثلاً ایک جگہ سڑک ہو لیکن اس میں پھیر اور موڑ ہوں۔ خطِ مستقیم کی طرح سیدھی نہ ہو باقی اعوجاجِ اضافی منزلِ مقصود کے اعتبار سے ہوتا ہے مثال کے طور پہ ایک سڑک خطِ مستقیم کی طرح بالکل سیدھی جارہی ہو لیکن منزلِ مقصود سے ہٹ کر ہو یہ اضافی کجی ہوئی۔ اسی طرح استقامت کی بھی دو قسمیں ہیں ذاتی اور اضافی۔ ذاتی استقامت جس میں اپنی ذات کے اعتبار سے کوئی کجی نہ ہو خطِ مستقیم کی طرح ہو اور اضافی استقامت یہ ہوگی کہ منزلِ مقصود کے اعتبار سے قریب ترین ہو اگرچہ ذات کے اعتبار سے اس میں کجی ہو۔

دینِ اسلام ذاتاً و اضافتاً سیدھی سڑک ہے

مندرجہ بالا تفصیل کے بعد اب یہ سمجھنا آسان ہے کہ قرآن پاک میں صراطِ مستقیم دینِ اسلام کو کہا گیا ہے جو ذات کے اعتبار سے بھی سیدھی سڑک کی طرح ہے جس میں کوئی موڑ نہ ہو اور اضافت کے اعتبار سے بھی قریب ترین راستے کی طرح ہے اسلام میں نہ ذاتی کجی ہے اور نہ اضافی کجی ہے منزلِ مقصود جنت ہے تو دینِ اسلام کے صراطِ مستقیم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اولادِ آدم کے جنت تک پہنچنے کے لئے یہ ایک بالکل سیدھی اور قریب ترین سڑک ہے۔

نعمت انعام کا حقیقی معنی ہے اِیْصَالُ النَّفْعِ دُنْیَوِیًّا کَانَ اَوْ اُخْرَوِیًّا۔ (فائدہ پہنچانا خواہ یہ فائدہ دنیا کا ہو یا آخرت کا)

المغضوب غضب کی تعریف یہ ہے کَیْفِیَّۃٌ نَفْسَانِیَّۃٌ تُوْجِبُ الْاِنْتِقَامَ: (یعنی غضب اس نفسانی کیفیت کا نام ہے جس کا تقاضا مغضوب علیہ (جس پر غصہ ہو) سے انتقام لینا ہو۔

ولا الضَّآلِّیْنَ۔ ضلالت عربی زبان میں کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے تفصیل ملاحظہ ہو۔

ضلالت کے مختلف معانی

عربی میں ضلالت کا ایک معنی فقدانِ حق ہے

یعنی حق اور سچ نہ پہنچا ہو چنانچہ قرآن پاک کی آیت وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کا معنی ہوگا۔
وَوَجَدَكَ قَبْلَ الْبَعْثَةِ اور پایا آپ کو اس حال میں کہ آپ کے پاس کوئی
فَاقِدًا الشَّرِيعَةِ فَهَدَاكَ لَهَا۔ دستور العمل نہ تھا تو آپ کو بذریعہ وحی (
اس کی ہدایت دی) چونکہ بعثت سے قبل موجودہ شکل میں شریعت نہ تھی اس کے فقدان کو ضلالت
سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے اس لئے کہ آیت قرآنی میں محکی عنہ زمانہ قبل
از بعثت کا ہے یعنی جس دور کے بارے میں فقدان شریعت کا ذکر ہے وہ نزول وحی سے قبل کا ہے
(۲) دوسرا معنی ضلالت کا انحراف عن الحق ہے (سچائی سے منہ موڑ لینا) عام طور پر قرآن و حدیث
میں ہدایت کے مقابلہ میں ضلالت کا استعمال اسی معنی میں ہوتا ہے اور یقیناً یہ ایک برائی اور عیب
کی بات ہے ضلالت کا تیسرا معنی اَلْخَطَاءُ ہے (غلطی) یہ معنی بھی مذموم نہیں ہے بلکہ قرآن پاک
میں ضلالت اس معنی میں استعمال ہوا ہے چنانچہ سورۂ یوسف میں ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام نے ایک
موقعہ پر اپنے والد گرامی حضرت یعقوب علیہ السلام کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا اِنَّكَ لَفِي
ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ (بے شک آپ قدیم ویرانی غلطی میں ہیں) یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت یوسف کے بھائی
انبیاء ہوں یا نہ ہوں جیسا کہ بعض نے کلام کیا ہے بہر صورت پر اپنے والد گرامی کا احترام ضرور کرتے

ـــہ حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ جب حضرتؐ جوان
ہوئے قوم کے مشرکانہ اطوار اور بے ہودہ رسم وراہ سے سخت بیزار تھے اور قلب میں خدائے واحد کی عبادت کا
جذبہ پورے زور کے ساتھ موجزن تھا۔ عشق الٰہی کی آگ سینۂ مبارک میں بڑی تیزی سے بھڑک رہی تھی وصول الی
اللہ اور ہدایت خلق کی اس اکمل ترین استعداد کا چشمہ جو تمام عالم سے بڑھ کر نفس قدسی میں ودیعت کیا گیا تھا
اندر ہی اندر جوش مارتا تھا لیکن کوئی صاف کھلا ہوا راستہ اور مفصل راستہ اور مفصل دستور العمل بظاہر
دکھائی نہ دیتا تھا جس سے اس عرش و کرسی سے زیادہ وسیع تاب ذات کو تسکین ہوتی اسی جوش طلب اور فرط محبت میں آپ بیقرار اور سرگرداں پھرتے
اور غاروں اور پہاڑوں میں جا کر مالک کو یاد کرتے اور محبوب حقیقی کو پکارتے آخر اللہ تعالیٰ نے غار حرا میں فرشتہ کو وحی دیکر بھیجا اور وصول الی اللہ
اور اصلاح خلق کی تفصیل راہیں آپ پر کھول دیں یعنی دین حق نازل فرمایا۔ (حاشیہ عثمانیؒ تحت آیت وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (احقر علی عنہ

تھے اس لئے یہاں مذموم معنی مراد نہیں ہو سکتے بلکہ بے غبار معنی یہ ہیں کہ اے باپ آپ یوسف
کے پیار د محبت کی وجہ سے پرانی اور قدیم خطا میں پڑے ہوئے ہیں۔

(۲)

سورہ فاتحہ کی تفسیر ادبی

معارف و نکات کے ضمن میں ایک ضروری وضاحت

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآنِ پاک کے جو
معانی اور مطالب اسلاف سے منقول ہیں وہ ہی حق ہیں اور تفسیر کا درجہ رکھتے ہیں البتہ سلفی معنی
کو برقرار رکھتے ہوئے تاویل کے درجہ میں جو معارف اور نکات بیان کئے جاتے ہیں وہ موہبتِ
الہٰی ہیں جو منجانب اللہ علماء حق کو عطا فرمائے جاتے ہیں۔ سلف صالحین میں جیسا کہ علامہ آلوسیؒ
صاحب تفسیر روح المعانی اور علامہ رازیؒ صاحب تفسیر کبیر نے سورۃ الفاتحہ کا ایک نام تعلیم المسئلہ
بھی رکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بارگاہ خداوندی میں یہ سورۃ ایک درخواست ہے جو ایک مومن
کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو۔

سورۃ الفاتحہ ایک درخواست ہے

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک انسان جب کسی کو درخواست پیش کرتا ہے
تو درخواست میں حسب ذیل امور ہوتے ہیں (۱) کاتب یعنی درخواست لکھنے والا۔
(۲) مکتوب الیہ یعنی جس کے نام درخواست ہوتی ہے۔
(۳) کاتب اور مکتوب الیہ کے درمیان تعلقات کا بیان ہوتا ہے۔

(۴) تعیینِ مقصد یعنی درخواست کا اصل مقصد کیا ہے؟ اب یہاں کاتب یعنی درخواست دہندہ تو سورۃ فاتحہ پڑھنے والا ہر مسلمان ہے اور مکتوب الیہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی ذاتِ گرامی ہے درخواست میں محکمہ کی تعیین بھی ایک ضروری امر ہے مثلاً درخواست اگر محکمہ صحت سے متعلق ہے تو ہیلتھ آفیسر یا سیکرٹری ہیلتھ یا وزیر صحت وغیرہ کے نام درخواست لکھی جائے گی۔

سورہ فاتحہ میں درخواست کے مضامین

اب سورۃ فاتحہ میں بحیثیت درخواست مندرجہ بالا امور کو دیکھنا ہے تو سب سے پہلے تعیین محکمہ یعنی ہماری درخواست کس محکمہ سے متعلق ہے؟ یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ اسماء باری اور صفاتِ باری بقول شیخ اکبرؒ قائم مقام محکموں کے ہیں۔ تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں محکموں کی تعیین کر دی گئی ہے وہ یوں کہ یہاں اللہ تعالیٰ کے تین ناموں کا ذکر ہے۔ اللہ۔ رحمٰن۔ رحیم۔ وجودِ کائنات اور بقائے کائنات کا تمام ساز و سامان الوہیت سے متعلق ہے اس لئے کہ اللہ اسمِ ذات اور جلالی اسم ہے عدم کو ہٹا کر کسی چیز کو وجود میں لانے کے لئے قوت اور طاقت کی ضرورت ہوتی ہے فرمایا اِنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا۔ (قوت و طاقت تو ساری ہی اللہ کے پاس ہے) تو تسمیہ میں لفظ اللہ جو اسم جلالی ہے اس طرف مشیر ہے۔ وجود کے بعد فوائد اور ضروریاتِ دنیا کا مسئلہ ہے صفتِ رحمٰن اس کی طرف مشیر ہے اور پھر دنیا کے بعد فوائد اخرویہ کا نمبر ہے یہ فوائد صفتِ رحیم سے متعلق ہیں مفسرین مثلاً بیضاوی کا صاحب روح المعانی جیسا کبیر نے رَحْمٰنُ الدُّنْيَا وَرَحِيمُ الْآخِرَةِ۔ (دنیا کا رحمٰن اور آخرت کا رحیم) کہکر اسی حقیقت کو واضح کیا ہے صرف تعبیر کا فرق ہے اور غور کیا جائے تو کائنات کی حقیقتاً ترتیب بھی یہی ہے پہلے وجود ملتا ہے پھر دنیا کی باری ہے اور پھر آخرت کا معاملہ درپیش ہوگا تو مطلب یہ ہے کہ ہماری درخواست کا تعلق محکمۂ الوہیت پھر رحمانیت اور پھر محکمۂ رحیمیت سے ہے تین محکموں سے تعلق بعید از عقل نہ سمجھا جائے اس لئے کہ آج کل بھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک درخواست کا تعلق چند محکموں سے ہوتا ہے مثلاً محکمہ تعلیم میں اگر درخواست دینی ہو تو ڈاکٹری سرٹیفکیٹ

کے لئے محکمۂ صحت سے رجوع کرنا ہوتا ہے اور چال چلن کے سرٹیفکیٹ کیلئے محکمۂ پولیس۔ یوں ہی ہماری درخواست کا تعلق بھی خدائی محکموں سے ہے جس کا تسمیہ میں اشارہ کردیا گیا ہے یعنی اللہ، رحمٰن، رحیم۔

سورۂ فاتحہ میں القاب اور مناصب خداوندی

درخواست میں ایک اہم چیز یہ ہوتی ہے کہ جس کے نام درخواست ہوتی ہے اس کے عہدوں اور القاب کا ذکر بھی ہوتا ہے سورۂ فاتحہ درخواست کی حیثیت سے اس سے خالی نہیں بلکہ سورۂ کے شروع ہی میں اللہ تعالیٰ کے پانچ عہدوں، منصبوں اور القاب کا ذکر ہے جو یہ ہیں (۱) محمودیت۔ (۲) ربوبیت عامّہ۔ (۳) رحمت عامّہ۔ (۴) رحمتِ خاصہ۔ (۵) عدالت الہیہ۔ ان القابات کے مأخذ سورہ فاتحہ کی یہ آیات ہیں الحمد للہ سے اللہ تعالیٰ کی صفت محمودیت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ محمود خلائق ہے سب اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ربّ العلمین میں ربوبیت عامّہ کی طرف اشارہ ہے۔ الرحمٰن سے رحمت عامہ کا پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں جس کا اظہار بلا تفریق کفر و ایمان ہو رہا ہے۔ الرّحیم سے رحمت خاصہ کی طرف اشارہ ہے جس کا اظہار قیامت میں صرف جنتیوں پر خصوصی احسان کے ذریعہ ہوگا مالک یوم الدّین۔ سے عدل و انصاف ظاہر ہو رہا ہے کہ قیامت کے دن بندوں کی قسمت کا فیصلہ فرما کر انصاف فرمائیں گے۔ اور اس دن اقتدار صرف اللہ تعالیٰ کا ہوگا۔

کاتب و مکتوب الیہ کے تعلقات

درخواست میں ایک اہم چیز کاتب و مکتوب الیہ کے درمیان تعلقات کا تذکرہ ہوتا ہے کہ درخواست دہندہ مقصود بیان کرنے سے قبل اپنے تعلقات کا ذکر کرتا ہے مثلاً یوں کہا جاتا ہے کہ میں حضور کا غلام ہوں۔ نیاز مند ہوں یا پرانا خدمت گزار ہوں وغیرہ۔ سورۂ فاتحہ میں ان تعلقات کا ذکر اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ (صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں) کیا گیا ہے یعنی گویا یوں کہا گیا ہے کہ اے اللہ ہم ہمیشہ سے آپ کے عابد ہیں اور آپ ہمارے معبود ہیں اور ہم مدد خواہ

ہیں اور آپ ہمارے معین و مددگار ہیں چونکہ آپ سے ہمارا تشریعی اور تکوینی دونوں قسم کا تعلق ہے اس لئے ہماری درخواست قابلِ پذیرائی ہے چنانچہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں تشریعی تعلق اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْن سے تکوینی تعلق ظاہر ہو رہا ہے۔

درخواست کا مقصد

درخواست میں بنیادی چیز درخواست کا مقصد متعین کرنا ہوتا ہے کیونکہ درخواست دہندہ جب تک اپنے مقصد کی وضاحت نہیں کر دیتا تو کسی محکمہ کا کوئی افسر بھی ایسی درخواست کو قابل توجہ نہیں سمجھتا اس لئے ہماری یہ درخواست جو بندوں کی طرف سے اللہ رَبّ العٰلمین کے دربار میں پیش کی جاتی ہے اس میں مقصد متعین کرنے کے لئے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْم کا جامع جملہ تلقین فرمایا گیا ہے (اے اللہ ہم کو سیدھی راہ پر چلا) کہ ہمارا مقصد عظیم یہ ہے کہ ہم کو صراط مستقیم نصیب ہو جائے بس ہماری درخواست کا مقصد و مدعیٰ صرف اور صرف یہی ہے۔ ہم نہ چاندی سونا خدا سے اس درخواست میں طلب کرتے ہیں نہ کار و بلڈنگیں نہ بنک بیلنس نہ کرۂ ارضی کی حکومت اور نہ ہی جسمانی صحت۔ بے شک یہ سب چیزیں ایک مؤمن کا مطلوب ہو سکتی ہیں لیکن بارگاہ خداوندی میں حاضری کے وقت ان مذکورہ اشیاء کا ذکر نہیں کیا گیا اس لئے کہ یہ ثانوی درجے کی اشیاء ہیں۔ صراط مستقیم کی ہدایت کے مقابلے میں ایک عقلمند انسان کے نزدیک یہ چیزیں پر مگس کے برابر بھی نہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد میں اسی حقیقت کو بیان فرمایا گیا ہے۔

لَوْ کَانَتِ الدُّنْیَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰہِ جَنَاحَ بَعُوْضَۃٍ مَا سَقَی اللّٰہُ الْکَافِرَ شَرْبَۃَ مَاءٍ او کما قال علیہ السلام

اگر دنیا اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافر کو پانی کا گھونٹ بھی نہ پلاتا

مطلب یہ ہے کہ صرف دنیا اور اس کی اشیاء کی کوئی اہمیت نہیں ہے اگر خدا کے ہاں اس کی کوئی اہمیت و قدر ہوتی تو پھر اس درخواست میں اس کے طلب کرنے اور مانگنے کا طریقہ بتایا ہوتا۔ صراط مستقیم کی ہدایت ایک سعادتِ عظیمہ ہونے کی وجہ سے بندگانِ خدا کی درخواست کا مقصود ہے

صراط مستقیم کا مطلب اور جامعیت

صراطِ مستقیم کی ہدایت دین و دنیا کی جامع ہے قرآنِ پاک کی ایک آیت میں فرمایا۔

"وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ" (پھر ہم نے انسان کو دونوں راستوں کی ہدایت دی) یہاں دین و دنیا کے دو راستے بھی مراد ہو سکتے ہیں الغرض چونکہ فاتحہ میں ہماری درخواست ایک فوق الکل چیز سے متعلق ہے اس لئے اس کے بعد بطور بدل صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا) کو لایا گیا ہے جو مقصود میں داخل ہے، مطلب یہ ہے کہ اے اللہ ہمیں انعام یافتہ لوگوں کے راستے پر چلا۔ یہ انعام یافتہ کون ہیں؟ قرآن پاک کی سورۃ نساء میں انعام یافتہ حضرات کی فہرست بتائی گئی ہے فرمایا۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔

جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے تمام اشخاص جنت میں ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے خاص انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء علیہم السلام، صدیقین، اور شہداء اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔

(رزقنا اللہ رفقتہم آمین علی الصغر غفی عنہ)

صراط الذین کو بطور بدل لانے کا فائدہ

صراط الذین انعمت علیہم کو بطور بدل لانے کا ایک فائدہ تخصیص کا حاصل ہونا ہے مطلب یہ ہے کہ ہماری درخواست کا تعلق صرف دینی ہدایت سے ہے اس لئے کہ آیت میں جنکو انعام یافتہ قرار دیا گیا ہے وہ سب دینی رہنما ہیں جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہماری درخواست کا مقصد صرف دینی ہدایت ہے۔ جہاں تک دنیوی ہدایت کا تعلق ہے تو اس کے حصول کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہماری کھوپڑی یعنی عقل بھی ودیعت فرما رکھی ہے جو عمومی طور پر عقل سے کام لے گا تو دنیا میں ہدایت یافتہ ہو سکتا ہے جبکہ دینی ہدایت کا ذریعہ صرف

وہی انعام یافتہ طبقہ ہے جن کی فہرست آیت سورۂ نساء میں دی گئی ہے۔

صراط الذین انعمت علیہم کو بطور بدل لانے کا دوسرا[۲] فائدہ یہ ہے کہ اس سے بغیر کسی اشتباہ کے مقصد متعین ہوگیا ہے۔ بات یہ ہے کہ صراطِ مستقیم کی جب کوئی محسوس صورت ہمارے سامنے موجود نہ ہوتی تو اشتباہ اور غلطی کا امکان تھا لیکن جب ہمارے سامنے ہدایت یافتہ جماعت بطور نمونہ کے محسوس شکل وصورت میں موجود ہے جن کی اتباع کر کے ہدایت صراطِ مستقیم حاصل کی جا سکتی ہے تو اب اشتباہ کا موقعہ نہیں رہتا یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور آپ کی، تعلیمات مزید برآں صدیقین۔ شہدآء ۔ صالحین کی زندگیاں اور تعلیمات ہمارے لئے مشعلِ راہ بن سکتی ہیں الغرض صراطِ مستقیم کی محسوس شکل بنادی گئی ہے۔

الفاظ صدّیقین، شہداء صالحین کی وضاحت

علامہ آلوسی صاحب روح المعانی نے اور دیگر محققین صوفیاء نے لکھا ہے کہ اگر اعمالِ صالحہ کا صدور اعتقاد کے تحت ہو مثلاً نماز۔ روزہ۔ وغیرہ تمام عباداتِ مالیہ۔ بدنیہ۔ قولیہ۔ اس نیت سے ہوں کہ آخرت میں انکا عظیم فائدہ ہوگا۔ تو قرآنی اصطلاح میں اس کا نام صلاح ہے اور یہ صالحین کا مقام ہے اور اگر یہ اعتقاد یقین و مشاہدہ کے درجہ میں ہو تو یہ شہدآء کا مقام ہے۔ جہاد اسلامی کے ضمن میں خدا کے نام پہ اپنی جان قربان کرنے والے کا نام بھی شہید اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ اپنے عمل کے نتائج کا مشاہدہ کرتا ہے یا اس لئے کہ اس نے اپنی جان کی قربانی پیش کر کے اس پختہ اعتقاد کی عملی شہادت دیدی ہے الغرض اعتقادی درجہ سے بڑھ کر درجہ شہادت کا ہے اس کی محسوس مثال یہ ہے کہ جیسے کسی سے بطور انعام دس ہزار روپے کا وعدہ کیا گیا اس وعدہ پہ یقین اعتقادی درجہ ہے اور جب دس ہزار کے نوٹ اس کے سامنے لا کر رکھ دیئے جائیں جن کو آنکھوں سے مشاہدہ کرے تو یہ درجہ شہادت ہے۔ اور اگر اعمال کا صدور درجہ شہادت سے بڑھ کر ہو یعنی فوق المشاہدہ کہ جہاں کسی قسم کا شک بالکل باقی نہیں رہتا جبکہ مشاہدہ میں شک کا خطرہ ہو سکتا ہے تو یہ مقام صدیقین کا ہے چنانچہ حضرت علیؓ

ہے منقول ہے فرمایا لَوِارْتَفَعَ الْحِجَابُ مَا ازْدَدْتُ يَقِيْنًا (اگر پردہ بھی اٹھ جائے تو میرے یقین میں اضافہ نہ ہوگا) اس سے معلوم ہوا کہ یقین سے اوپر بھی کوئی چیز ہے۔ جو مشاہدۂ اجر کے علاوہ ہے اور وہ معطیٔ اجر یعنی اللہ جل شانہ، کا شہود علمی ہے یہی صدیقیت کا مقام ہے رہا شہودِ بصری تو وہ آخرت میں ہوگا۔ حدیث اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ۔ (تم عنقریب اپنے رب کو دیکھو گے) میں اسی شہودِ بصری کا ذکر ہے۔

صحابہ سب صدیق تھے

الغرض صدیقین کا تعامل صراطِ مستقیم کی ہدایت ہے یعنی راہ ہدایت ہے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سب کے سب صدیق تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مرتبہ ان صحابہ رضی اللہ عنہم میں صدیقیت کے لحاظ سے بڑھا ہوا تھا اسی اعتبار سے ان کو صدیق اکبر کہا جاتا ہے۔ ان کو صدیق کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ باقی صحابۂ کرام صدیق نہ تھے بلکہ تمام صحابہ صدیقین تھے اور شہداء و تابعین کی جماعت ہے اور صالحین تبع تابعین سے لے کر قیامت تک تمام بزرگان دین سب کے سب صالحین کی جماعت میں شامل ہیں۔

سلف صالحین مدارِ حق ہیں

سورۃ فاتحہ میں انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ صدیقین شہداء، صالحین کو انعام یافتہ قرار دے کر یہ بات واضح فرمائی گئی ہے کہ سلف مدارِ حق ہیں اگر خدانخواستہ سلف حق پر نہ ہوں تو پھر دنیا میں حق کہیں نہیں ہوگا۔ میں اس کی ایک محسوس مثال دیا کرتا ہوں کہ مثلاً دریائے سندھ جو گلگت سے نکلتا ہے اور اٹک سے ہوتا ہوا کوٹ مٹھن پہنچتا ہے اگر اٹک میں پانی نہ ہو تو کوٹ مٹھن میں پانی کہاں سے آئے گا؟ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سرچشمۂ دین ہیں اور صحابۂ کرام آپ کے شاگرد اور پروانے ہیں جن سے نبی کا دین امت کو ملا ہے اگر حضرات صحابہ میں حق اور دین موجود نہ ہو تو ہمارے پاس کہاں سے آئے گا؟ خلاصہ یہ کہ ہمکو سورۃ فاتحہ کی درخواست میں بتایا گیا ... صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے متبعین قیامت

تک آنے والے بزرگان دین کی راہ ہے اسی راستے پر قائم رہنے کی کوشش جاری رہنی چاہیئے۔
ان حضرات سے ہٹکر گمراہی اور ضلالت کے عمیق گڑھے کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ نماز کی ہر رکعت میں
ہمیں یہ درخواست بار بار کرنے کی تلقین اسی اہمیت کے پیش نظر دی ہے۔

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ۔ یعنی اے اللہ ہم انعام یافتہ لوگوں کا راستہ
مانگتے ہیں جو نہ مغضوبین ہیں اور نہ ضالین اس جملے سے ہماری درخواست منفی و مثبت ہر پہلو سے
مکمل ہوگئی ہے ماقبل میں انعام یافتہ حضرات کو رہنما اور ہدایت کا نمونہ بنایا گیا ہے اب اس جملہ
میں اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے کہ یہ مُنْعَمٌ عَلَيْهِمْ (جن پر انعام فرمایا گیا) حضرات جو
ہمارے لئے معیار حق ہیں نہ تو اللہ کے غصے کے مورد ہوئے ہیں اور نہ گمراہ ہیں اس سے وہ
اعتراض بھی رفع ہوگیا کہ وجود انعام دوام انعام کو مستلزم نہیں یعنی ممکن ہے کہ انعام یافتہ لوگ
ایک وقت میں منعم علیہم ہوں اور کسی وقت فساد عقیدہ یا فساد عمل کی وجہ سے منعم علیہم نہ رہے ہوں
جیسا کہ ایک حدیث نبوی میں فرمایا گیا ہے۔
يُصْبِحُ الْمَرْءُ مُؤْمِنًا وَيُمْسِي ایک وقت آئے گا کہ ایک آدمی صبح تو مومن ہوگا
كَافِرًا وَيُمْسِي مُؤْمِنًا وَيُصْبِحُ كَافِرًا او كما قال شام کو کافر اور ایک شام کو مؤمن ہوگا اور صبح کو کافر)
لیکن غیر المغضوب الایۃ کے جملے نے یہ احتمال ختم کر دیا ہے کہ ہم جن کا راستہ طلب کر رہے
ہیں وہ نہ مغضوب ہیں نہ ضالین علاوہ ازیں یہاں یہ خاتمہ کو بھی کامیابی کا معیار بنایا گیا ہے ایک
حدیث میں ہے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ اعمال کے قبول و عدم قبول کا مدار
خاتمہ پر ہے) الغرض سورۃ فاتحہ میں جو درخواست حق تعالیٰ شانہ نے بندوں کو تلقین فرمائی
اس میں کہا گیا ہے کہ تم ان انعام یافتہ حضرات کی راہ طلب کرو جن کا مُنْعَمٌ عَلَيْهِمْ ہونا
اور مؤمن ہونا دوام کو مستلزم ہے اس سے صحابہ کرام اور ان کے متبعین کا راہ راست پر ہونا واضح
ہوگیا۔ الغرض راہ ہدایت ایک مقصد عظیم ہے اس لئے اس کی تعلیم تاکیداً فرمائی گئی ہے۔

صراط المستقیم کی تعبیر میں ایک خاص نکتہ

یہاں صراط المستقیم کی تعبیر میں ایک خاص نکتہ ہے جس کی تفصیل یوں ہے کہ ہدایت طلب کرنے کے لئے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ فرمایا ہے صراط المتوحدین نہیں فرمایا۔ (ایک ہونے والوں کا راستہ) بات یہ ہے کہ توحد کا مقابل تعدد ہے اور تعدد خلاف ہدایت نہیں ہے جب کہ استقامت کا مقابل اعوجاج ہے۔ اور اعوجاج (ٹیڑھا پن) خلاف ہدایت ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کے متعلق ارشاد خداوندی ہے۔ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا۔ (اور نہیں رکھی اس میں کوئی کجی) معلوم ہوا کہ اعوجاج ہدایت کے منافی ہے نہ کہ تعدد کے۔ استقامت کی دو قسمیں ہیں ایک استقامت ذاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز اپنی ذات کے اعتبار سے ہر قسم کی کجی سے پاک ہو۔ اور دوسری استقامت اضافی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز منزلِ مقصود کے اعتبار سے سیدھی ہو اس میں کجی نہ ہو۔ اور منزلِ مقصود کبھی امر غیر ممتد ہوتا ہے یعنی اس میں امتداد نہیں ہوتا جیسے کہ نقطہ ہے اس سے جو خط کھینچا جائے گا اس میں استقامت بھی ہوگی اور اس میں توحد بھی ہوگا اور اگر منزلِ مقصود ممتد ہو جیسے لمبی لکیریں جو خطوط نقطے تک پہنچیں گے وہ مستقیم ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد بھی ہوں گے اس سے معلوم ہوا کہ استقامت کا وجود کبھی توحد کے ساتھ ہوگا اور کبھی تعدد کے ساتھ ہوگا راستوں کا متعدد ہونا استقامت اور ہدایت کے منافی نہیں ہے۔ یہ تفصیل اس لئے کی گئی ہے کہ آج کل ناواقف لوگ اعتراض کر دیتے ہیں کہ آپ کے صراط مستقیم میں توحد کے بجائے تعدد ہے یعنی احناف۔ مالکیہ۔ شوافع۔ حنابلہ۔ اہل سنت کے چار مذاہب کہلاتے ہیں۔ تو ہماری بیان کردہ تفصیل سے اس سوال کا جواب آ گیا اور یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ چاروں مذاہب حق ہیں اور باوجود تعدد کے تمام صراطِ مستقیم ہی ہیں اس لئے کہ استقامت

کی ضد و مقابل تعدّد نہیں بلکہ اعوجاج (ٹیڑھا پن) ہے۔

مذاہب اربعہ کی ایک محسوس مثال

اس کی ایک محسوس مثال یوں سمجھیں کہ کراچی شہر میں ایک مشہور سڑک بندر روڈ ہے اس روڈ پر ایک طرف کاروں اور بسوں کا راستہ ہے اور ساتھ ٹرام[1] کا راستہ بھی ہے اور پھر پیدل چلنے والوں کے لئے فٹ پاتھ بھی ہے اب اس بندر روڈ کو صراطِ مستقیم کہنا بایں معنی درست ہے یہ ایک سیدھی سڑک ہے لیکن باوجود سیدھی سڑک ہونے کے اس میں راستے مختلف ہیں، جو استقامت کے خلاف نہیں یہ راستے باوجود متعدد ہونے کے ایک ہی منزل پر پہنچانے والے ہیں یوں ہی دین اسلام جو ایک عظیم راستہ ہے خداوند تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا اس میں مذاہب اربعہ کو اُسی طرح سمجھنا چاہیئے جس طرح ایک بڑی سڑک پر سہولت کے لئے مختلف راستوں کی تقسیم کرلی جاتی ہے۔ مذاہب اربعہ دین کی سڑک کے چار راستے ہیں جن کی منزل مقصود ایک ہی ہے۔

③ سورہ فاتحہ کی اخلاقی تفسیر

لفظ اخلاق کی تشریح

اخلاق خلق بضمۃ الخاء کی جمع ہے چنانچہ امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں لکھا ہے اَلْخَلْقُ بِفَتْحِ الْخَا وَالْخُلُقُ بِضَمِّ الْخَاءِ وَاحِدٌ اِلَّا اَنَّ الْاَوَّلَ يُسْتَعْمَلُ فِي الْاَشْكَالِ وَالصُّوَرِ وَالثَّانِي فِي الْمَعَانِي وَالسِّيَرِ (خَلق زبر سے اور خُلق خاء کی پیش سے اصل میں دونوں کا مطلب ایک ہی ہے یعنی پیدائش۔ ہاں اس قدر فرق ضرور ہے کہ خاء کے فتح سے خلق ظاہری شکل وصورت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ لفظ خلق خاء کے ضمہ سے اس کا استعمال معانی، سیرت اور مخفی صفات کے لئے ہوتا ہے) یعنی ظاہری تخلیق کا نام

---

[1] اب ٹرام کا سلسلہ اس سڑک پر ختم کر دیا گیا ہے۔ (علی اصغر عفی عنہ)

خلق ہے اور مخفی صفات کا نام خُلق ہے۔

اخلاق کی حقیقت
حضرت امام غزالیؒ کے الفاظ میں

حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اخلاق کی بہترین شرح فرمائی ہے جس سے سیرت کی حقیقت بھی معلوم ہوجاتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

لِلْاِنْسَانِ جَسَدٌ وَرُوْحٌ وَلِکُلٍّ وَاحِدٍ مِنْھُمَا حُسْنٌ وَقُبْحٌ فَحُسْنُ الْجَسَدِ بِتَنَاسُبِ الْاَعْضَاءِ وَحُسْنِ الشَّکْلِ وَاللَّوْنِ وَحُسْنُ الرُّوْحِ یَکُوْنُ بِالْاَخْلَاقِ الْمَحْمُوْدَۃِ وَقُبْحُھَا بِالْاَخْلَاقِ الْمَذْمُوْمَۃِ۔ وَالرُّوْحُ حَقِیْقَۃُ الْاِنْسَانِ وَالْجَسَدُ قَالِبُہٗ۔

حضرت امام کی عربی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے دو نقشے ہیں ایک ظاہری دوم باطنی۔ ظاہری نقشہ تو قالب ہے جس کو صورت بھی کہتے ہیں اور باطنی نقشہ وہ انسانی کمالات ہیں جن کو سیرت کہا جاتا ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دونوں انسانی نقشے خوبصورت بھی ہوتے ہیں اور بدصورت بھی۔

جسمانی اور ظاہری نقشے کی خوبصورتی یہ ہے کہ ایک انسان کے جسمانی اعضاء متناسب بھی ہوں اور رنگ و شکل بھی خوبصورت ہو، اور اگر اعضا غیر متناسب ہونے کے علاوہ رنگ بھی اچھا نہ ہو تو یہ جسمانی بدصورتی کہلائے گی۔ اسی طرح روح کی خوبصورتی اخلاق محمودہ کے تناسب سے ہوگی اور اگر اخلاق مذمومہ ہوں یہ روحانی بدصورتی ہوگی۔ چونکہ اصل انسان روح کا نام ہے اس لئے روحانی حسن و خوبصورتی جسم کی نسبت زیادہ اہم اور ضروری ہے اور جسم انسانی تو روح کے لئے قالب ہے۔

روحانی و جسمانی حسن و قبح کے احتمالات

ہمارے نزدیک اس مقام پر جسم و روح کی خوبصورتی و بدصورتی کے عقلی احتمالات چار ممکن ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(۱) حُسْنٌ کُلِّیْھِمَا (دونوں خوبصورت ہوں) یعنی ظاہری اور باطنی دونوں صورتیں

اچھی ہوں. جیسا کہ حضرت طالوت علیہ السلام کے متعلق قرآنِ پاک میں ارشادِ خداوندی ہے، فرمایا:
وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ. الآية (اور اللہ تعالیٰ نے اسکو علم و جسامت میں زیادتی عطا فرمائی ہے.

(۲) قُبْحُ كِلَيْهِمَا (دونوں بدصورت ہوں)

(۳) حسن الجسد وقبح الروح : (یعنی جسم حسین اور روح قبیح ہو)

(۴) حسن الروح وقبح الجسد: (روح حسین اور جسم بدصورت ہو یہ نمبر ۳ کا عکس ہے)

ان چاروں احتمالات میں دو صورتیں غیر اختیاری ہیں یعنی حسن الجسد اور قبح الجسد (جسمانی خوبصورتی اور جسمانی بدصورتی) ان دونوں کے حسن قبح پر ہمارا کنٹرول نہیں بلکہ صرف خداوند تعالیٰ کے اختیار میں داخل ہیں چنانچہ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے.

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ. (اللہ کی ذات پاک وہ ہے جو تمہاری شکل و صورتیں بناتا ہے ماں کے پیٹ میں جسطرح چاہتا ہے)

یہ صرف خالقِ کائنات ہی کی صنعتکاری ہے کہ اربوں انسانوں میں ایک کی صورت دوسرے سے اس طرح نہیں ملتی کہ امتیاز نہ رہے.

هَلِ الْأَخْلَاقُ يَقْبَلُ الْإِصْلَاحَ أَمْ لَا ؟

کیا اخلاق قابل اصلاح ہیں یا نہ ؟

اَخلاق کے ضمن میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ کیا اَخلاق کی اصلاح ہو سکتی ہے ؟

اس کے جواب میں اہل یونان کے دو قول ہیں اور اہلِ ادیان کے بھی دو قول ہیں.

یونانی فلاسفہ کا خیال

یونانی فلاسفہ میں سے ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اَخلاق نا قابلِ اصلاح ہیں اور ان کی درستگی نا ممکن ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ جس طرح خَلق خَا کے فتح کے ساتھ یعنی انسان کی ظاہری شکل و صورت نا قابلِ تبدیل ہے اسی طرح خُلق ضمہ کے ساتھ یعنی انسان کی باطنی شکل و صورت بھی نا قابل

تبدیل ہے یونانیوں میں سے اس کا قائل ذی مقراطیس اور اس کا گروہ ہے۔
فلاسفۂ یونان میں کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ اخلاق قابل اصلاح تو ہیں لیکن اس کی صورت یہ بتاتے ہیں کہ انسانی جسم کو ریاضات شاقہ کے ذریعہ کمزور کر دیا جائے تو اصلاح ہو سکتی ہے دوسرے لفظوں میں اخلاقی طاقتوں کے سرچشموں کو ختم کر دیا جائے تو اخلاق کی اصلاح کا امکان ہے۔

ریاضاتِ شاقہ کی مثال یوں ہو سکتی ہے کہ ایک آدمی زمانۂ دراز تک کسی غار میں کھڑا رہے۔ اور آرام ترک کر دے نیز لذاتِ بدنیہ سے اجتناب کرے یہ قول سقراط اور افلاطون کا ہے۔ علاوہ ازیں غیر آسمانی مذاہب مثلاً بدھ مت اور برہمیت کے ماننے والے بھی اسی خیال کے قائل ہیں۔

عیسائیت کا نظریہ

ادیانِ سماویہ میں سے مسیحی دین میں بھی اخلاق کی اصلاح ناممکن ہے۔ اس لئے کہ ان کے عقیدہ کفارہ کیمطابق معصیت انسانی فطرت میں داخل ہے۔ ان کے ہاں نجات کی یہ صورت نہیں ہو سکتی کہ اخلاق مذمومہ یا گناہ سے نفسِ انسانی پاک ہو کر کامیابی حاصل کرے عیسائیت کے نزدیک معصیت انسانیت کی فطرت کے ساتھ اس طرح مربوط ہے جیسے آگ کے ساتھ حرارت مربوط ہے۔
ان کے نزدیک نجات کے لئے رحمت خداوندی کا ظہور مسیح کی شکل میں ہوا۔ اور مسیحؑ نے تختۂ دار پر چڑھ کر پوری امت عیسائیہ کی طرف سے کفارہ ادا کر دیا ہے۔ مسیحیوں کا یہ خیال اور نظریہ نہ صرف غلط ہے۔ بلکہ خطرناک نتائج کا حامل بھی ہے۔ اس کی وجوہات یہ ہیں۔

(۱) بقول ان کے اگر معاصی اور اخلاق مذمومہ انسانی روح سے الگ نہیں ہو سکتے تو اس کا نتیجہ یہ نکالا جا سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور کتب سماویہ کا انزال لغو اور بیکار ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اگر اخلاق کی اصلاح ناممکن تھی تو پھر اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء اور کتابوں کو کس مقصد کے لئے دنیا میں بھیجا۔ اور اس صورت میں ان کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔؟

(۲) مسیحیوں کا کفارے کا عقیدہ اگر درست ہو۔ تو پھر یہ ضرب المثل صادق آئے گی۔ کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی مسئلہ کفارہ یہی تو ہے کہ گناہ تو انسانوں نے کئے مگر اس کا کفارہ

بقول ان کے خدا کا بیٹا ادا کرے۔ اور مجرموں کے بجائے وہ سزا پائے؛
(۳) حقیقت یہ ہے کہ آسمانی مذاہب کی اصل غرض اور روح انسداد فساد ہے۔ اگر کسی کا عقیدہ یہ ہو۔ کہ فساد تو زندگی کا جزلاینفک ہے تو کوئی عقلمند بتائے کہ اس دنیا میں انسداد فساد کی کیا صورت ہوگی اس کا نتیجہ تو یہ ہوگا۔ کہ دنیا میں فسادات کم ہونے کے بجائے زیادہ ہوں گے۔ شائد یہی وجہ ہے۔ کہ دور حاضر میں عملی فسادات کا مرکز یورپین ملک ہیں جہاں کی غالب اکثریت مسیحیوں پر مشتمل ہے۔

اخلاق کی اصلاح و عدم اصلاح کے اقوال میں افراط و تفریط

غیر سماوی ادیان میں ہندومت اور بدھ مت کے نزدیک اگرچہ اخلاق قابلِ اصلاح ہیں لیکن یونانی فلسفیوں کی طرح اخلاق کی اصلاح کی صورت یہ بتاتے ہیں۔ کہ ایک آدمی پر از مشقت زندگی گزارے مثلاً مدت دراز تک ایک ٹانگ پہ کھڑا رہے اور کھانا وغیرہ بھی نہ کھائے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اصلاحِ اخلاق کے ضمن میں یہ نظریہ فلاسفہ یونان کا ہو۔ یا بدھ مت یا ہندومت وغیرہ کا ہو۔ عقل ونقل کے سراسر خلاف اور غلط ہے۔ اس لئے انسانوں میں جو قوتیں اللہ نے تخلیق فرمائی ہیں وہ یقیناً کسی حکمت کے تحت تخلیق ہوئی ہیں ورنہ ان قوتوں کو پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی ہمارے نزدیک یہ لوگ افراط و تفریط میں غرق ہیں افراط کے معنے زیادتی اور تفریط کا مطلب کمی ہے۔

اسلامی نظریہ

اسلام چونکہ دین فطرت ہے اور عالمگیر مذہب ہے اس نے اس مسئلے کا حل کہ اخلاق قابل اصلاح ہیں یا نہ؟ دو دونے چار کی طرح واضح اور صاف طور پر پیش کیا ہے اسلام یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اخلاق یقیناً قابل اصلاح، ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے تزکیہ نفوس اور تطہیر قلوب کے لئے اہم اور نہایت ضروری، ہدایات دی ہیں۔ پھر اسی عظیم مقصد کے لئے حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور کتب سماویہ

تبدیل ہے یونانیوں میں سے اس کا قائل دی مقراطیس اور اس کا گروہ ہے۔

فلاسفۂ یونان میں کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ اخلاق قابل اصلاح تو ہیں لیکن اس کی صورت یہ بتاتے ہیں کہ انسانی جسم کو ریاضات شاقہ کے ذریعہ کمزور کر دیا جائے تو اصلاح ہو سکتی ہے دوسرے لفظوں میں اخلاقی طاقتوں کے سرچشموں کو ختم کر دیا جائے تو اخلاق کی اصلاح کا امکان ہے۔

ریاضاتِ شاقہ کی مثال یوں ہو سکتی ہے کہ ایک آدمی زمانۂ دراز تک کسی غار میں کھڑا رہے۔ اور آرام ترک کر دے نیز لذاتِ بدنیہ سے اجتناب کرے یہ قول سقراط اور افلاطون کا ہے۔ علاوہ ازیں غیر آسمانی مذاہب مثلاً بدھ مت اور برہمنیت کے ماننے والے بھی اسی خیال کے قائل ہیں۔

عیسائیت کا نظریہ

ادیانِ سماویہ میں سے مسیحی دین میں بھی اخلاق کی اصلاح ناممکن ہے۔ اس لئے کہ ان کے عقیدہ کفارہ کے مطابق معصیت انسانی فطرت میں داخل ہے۔ ان کے ہاں نجات کی یہ صورت نہیں ہو سکتی کہ اخلاق مذمومہ یا گناہ سے نفسِ انسانی پاک ہو کر کامیابی حاصل کرے عیسائیت کے نزدیک معصیت انسانیت کی فطرت کے ساتھ اس طرح مربوط ہے جیسے آگ کے ساتھ حرارت مربوط ہے۔

ان کے نزدیک نجات کے لئے رحمت خداوندی کا ظہور مسیح کی شکل میں ہوا، اور مسیحؑ نے تختۂ دار پر چڑھ کر پوری امت عیسائیہ کی طرف سے کفارہ ادا کر دیا ہے۔ مسیحیوں کا یہ خیال اور نظریہ نہ صرف غلط ہے۔ بلکہ خطرناک نتائج کا حامل بھی ہے۔ اس کی وجوہات یہ ہیں۔

(۱) بقول ان کے اگر معاصی اور اخلاق مذمومہ انسانی روح سے الگ نہیں ہو سکتے تو اس کا نتیجہ یہ نکالا جا سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور کتب سماویہ کا انزال لغو اور بیکار ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اگر اخلاق کی اصلاح ناممکن تھی تو پھر اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء اور کتابوں کو کس مقصد کے لئے دنیا میں بھیجا۔ اور اس صورت میں ان کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔؟

(۲) مسیحیوں کا کفارے کا عقیدہ اگر درست ہو۔ تو پھر یہ ضرب المثل صادق آئے گی۔ کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی مسئلہ کفارہ یہی تو ہے کہ گناہ تو انسانوں نے کئے مگر اس کا کفارہ

بقول ان کے خدا کا بیٹا ادا کرے۔ اور مجرموں کے بجائے وہ سزا پائے؟

(۳) حقیقت یہ ہے کہ آسمانی مذاہب کی اصل غرض اور روح انسداد فساد ہے۔ اگر کسی کا عقیدہ یہ ہو۔ کہ فساد تو زندگی کا جزلا ینفک ہے تو کوئی عقلمند بتائے کہ اس دنیا میں انسداد فساد کی کیا صورت ہو گی اس کا نتیجہ تو یہ ہو گا۔ کہ دنیا میں فسادات کم ہونے کے بجائے زیادہ ہوں گے۔ شائد یہی وجہ ہے۔ کہ دور حاضر میں عملی فسادات کا مرکز یورپین ملک ہیں جہاں کی غالب اکثریت مسیحیوں پر مشتمل ہے۔

اخلاق کی اصلاح و عدم اصلاح کے اقوال میں افراط و تفریط

غیر سماوی ادیان میں ہندومت اور بدھ مت کے نزدیک اگرچہ اخلاق قابل اصلاح ہیں لیکن یونانی فلسفیوں کی طرح اخلاق کی اصلاح کی صورت یہ بتاتے ہیں۔ کہ ایک آدمی پر از مشقت زندگی گزارے مثلاً مدت دراز تک ایک ٹانگ پہ کھڑا رہے اور کھانا وغیرہ بھی نہ کھائے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اصلاح اخلاق کے ضمن میں یہ نظریہ فلاسفر یونان کا ہو۔ یا بدھ مت یا ہندو مت وغیرہ کا ہو۔ عقل و نقل کے سراسر خلاف اور غلط ہے۔ اس لئے انسانوں میں جو قوتیں اللہ نے تخلیق فرمائی ہیں وہ یقیناً کسی حکمت کے تحت تخلیق ہوئی ہیں ورنہ ان قوتوں کو پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی ہمارے نزدیک یہ لوگ افراط و تفریط میں غرق ہیں افراط کے معنے زیادتی اور تفریط کا مطلب کمی ہے۔

اسلامی نظریہ

اسلام چونکہ دین فطرت ہے اور عالمگیر مذہب ہے اس نے اس مسئلے کا حل کہ اخلاق قابل اصلاح ہیں یا نہ؟ دو دونے چار کی طرح واضح اور صاف طور پر پیش کیا ہے اسلام یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اخلاق یقیناً قابل اصلاح ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے تزکیہ نفوس اور تطہیر قلوب کے لئے اہم اور نہایت ضروری ہدایات دی ہیں۔ پھر اسی عظیم مقصد کے لئے حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور کتب سماویہ

نازل ہوا ہے۔ رہا قوتِ بہیمیہ کو کمزور کرنا اور ریاضاتِ شاقہ سے اخلاقی سرچشموں کو بند کرنا دینِ فطرت اس کی تردید کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں یہ قوتیں حکمت کے تحت پیدا کی ہیں ان کو بند کرنا تو خدائی تخلیق کا مقابلہ کرنا ہے۔

اسلام اخلاقی سرچشموں کا ازالہ کے بجائے امالہ کا قائل ہے

اسلام دین فطرت ہے اور یہ قوتِ بہیمیہ اور اخلاقی مرکزوں کو ختم، نہیں کرتا جس کو ازالہ کہا جاتا ہے بلکہ امالہ (رخ پھیرنا) کرتا ہے دوسرے لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ قوتیں تو باقی رہیں مگر ان کا رخ پھیر دیا جائے امالہ کا یہی مطلب ہے مثال کے طور پر انسان میں شہوت (چاہت) کا جذبہ موجود ہے اسی جذبے کے تحت کھانے۔ پینے وغیرہ کی چاہت رکھتا ہے اب اسلام یہ نہیں کرتا کہ چاہت کا جذبہ ہی سرے سے ختم ہو جائے پھر نہ کھانے کی چاہت ہو نہ پینے کی، بلکہ اسلام انسانی چاہت کی قوت کے ازالہ کے بجائے امالہ یوں کرتا ہے کہ حلال کھانے پینے کی چاہت ہو اور حرام کی چاہت سے اجتناب کیا جائے یوں ہی قوتِ جماع کا رخ زناء کے بجائے نکاح کی طرف ہو جائے۔ اسی کا نام قوتِ شہویہ کا امالہ ہے۔ یوں ہی انسانوں میں ایک قوتِ غضبیہ ہے جس کی وجہ سے آدمی ناراضگی اور غصّے کا اظہار کرتا ہے۔ اسلام اس قوت کا رُخ مسلمانوں کے بجائے کافروں کی طرف کر دیتا ہے یعنی مسلمانوں سے لڑنے کے بجائے کفار سے جہاد کیا جائے جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کے حالات پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی قوتِ غضبیہ کا رخ مسلمانوں کے بجا کفّار کی طرف ہو گیا تھا اسی بنا پر قرآنِ پاک میں ایک مقام پر ان کی تعریف یوں فرمائی ہے۔ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ۔ (کافروں کے مقابلے میں سخت اور آپس میں مہربان تھے) اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی قوتِ غضبیہ کا مصرف دشمنانِ خدا تھے اور شفقت ورحمت کا مصرف مسلمان تھے۔ اس مقام پر آیت کے شروع کا جملہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ۔ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ

کے رسول ہیں) ایک دعویٰ ہے پھر آگے آیت کے اختتام تک صحابہ کرام کی صفات بیان فرما کر اس دعویٰ کی دلیل بیان فرمائی ہے کہ آپ کے رسول اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جو لوگ آپ کے صحبت یافتہ تھے ان کی قوتوں کا امالہ ہو گیا تھا۔ دنیا میں لوگ اس ڈاکٹر کو قابل اور کامیاب سمجھتے ہیں جس کے علاج سے مریض شفایاب ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی شفاخانہ سے ہزاروں لاکھوں صرف شفایاب ہی نہیں ہوئے بلکہ مسیحا بن کر دنیا میں چمکے واقعی یہ منصب آپ ہی کے لائق تھا اسی لیئے تو انسانیت کے آخری دور کے لیئے آپ کو تہذیب نفوس کی خاطر منصب نبوّت عطا فرمایا گیا صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِ عَدَدَ خَلْقِ اللّٰهِ۔

اخلاقی قوتوں کے ازالہ و امالہ کی تفصیل احادیث سے تطبیق

اسلام جو انسانی فطرت کی آواز ہے اخلاقی قوتوں کو برقرار رکھ کر ازالہ کے بجائے امالہ کی تلقین کرتا ہے اس بیان سے دو حدیثوں کا مطلب بھی واضح طور پر سمجھ میں آجائے گا جبکہ بظاہر دونوں کے درمیان تعارض نظر آتا ہے چنانچہ ایک روایت میں ارشاد نبوی ہے۔

إِذَا سَمِعْتُمْ أَنَّ جَبَلًا زَالَ عَنْ مَكَانِهِ فَصَدِّقُوهُ وَإِذَا سَمِعْتُمْ أَنَّ رَجُلًا زَالَ عَنْ خُلُقِهِ فَلَا تُصَدِّقُوهُ۔

جب تم سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا ہے تو اس بات کی تصدیق کرو۔ اور جب تم یہ سنو کہ ایک آدمی اپنے اخلاق سے ہٹ گیا ہے یعنی اس کے اخلاق کا ازالہ ہو گیا ہے تو اس کی تصدیق نہ کرنا۔

اس حدیث شریف سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اخلاق ناقابل اصلاح ہیں حالانکہ بات یوں نہیں بلکہ حدیثِ بالا کا صاف مطلب یہ ہے کہ اخلاقی قوتوں کا اِزالہ نہیں ہو سکتا یعنی سرے سے یہ قوتیں ختم نہیں ہو سکتیں ازالہ اسی کو کہتے ہیں لیکن یہاں امالہ کا انکار نہیں بلکہ ایک روایت میں جو صحیحین میں موجود ہے اس کا اثبات ہے ارشاد فرمایا إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ (یعنی یقیناً میری بعثت کا مقصد مکارم اخلاق کی تکمیل ہے) الغرض حدیث اوّل میں

بہ فرمایا گیا ہے کہ اخلاق کا ازالہ نہیں ہوتا یعنی مثال کے طور پر ایک آدمی میں قوتِ غضبیہ پیدائشی طور پر موجود ہے یا قوتِ شہویہ فطرتاً موجود ہوتی ہے۔ یہ قوتیں ایک انسان میں موجود رہیں گی کلیتہً ختم نہیں ہوتیں ازالہ نہ ہونے کا یہی مطلب ہے اسی لئے حدیثِ اوّل میں خُلق کو بغیر تقیید کے ذکر فرمایا ہے یعنی خلق کے ساتھ کوئی قید مثلاً مذموم۔ محمود یا مکارم کی ذکر نہیں فرمائی گئی۔ جبکہ حدیثِ دوم میں مکارمِ اخلاق کا ذکر فرمایا ہے اسی کا نام امالہ ہے یعنی اخلاقی قوتوں کا رُخ اور دھارا مواقع خیر کی طرف موڑا جا سکتا ہے جس کے نتیجہ میں اخلاق محمودہ پیدا ہوتے ہیں۔

جن قوتوں سے اُخلاق بنتے ہیں

انسان میں تین اخلاقی قوتیں اور ان کی تعریفیں

وہ تین ہیں (۱) قوتِ شہویہ۔ (۲) قوتِ غضبیہ۔ (۳) قوتِ عقلیہ بعض اس کو قوتِ ملکیہ بھی کہتے ہیں یعنی روحانی قوت۔ قوتِ شہویہ سے مراد وہ قوت ہے جس کی بنا پر انسانی فطرت میں چاہت پیدا ہوتی ہے مثلاً انسانی طبیعت کا تقاضا کھانے پینے۔ لباس۔ مکان۔ بلوغ کے بعد نکاح کی طرف ہوتا ہے یہ سب چاہتیں قوتِ شہویہ کے تحت ہیں۔ شہوت کے لفظی معنی چاہت کے ہیں اگر فطرتاً یہ قوت انسان میں نہ ہو یا زائل کر دی جائے۔ تو کسی بھی چیز کی چاہت انسان میں باقی نہ رہے۔

قوتِ غضبیہ سے مراد دفاعی قوت ہے جو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف انسانوں میں بلکہ حیوانات میں بھی فطرتاً رکھی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہر ایک اپنے حقوق کی حفاظت کر سکتا ہے یوں ہی ایک اور قوت ہے جس کو قوتِ عقلیہ کہا جاتا ہے جو ایک روحانی قوت ہے اور انسان علوم اسی قوت کے ذریعہ سیکھتا ہے۔ ان تینوں طاقتوں اور قوتوں کے مجموعہ کا نام انسانی فطرت ہے۔

قوتِ شہویہ غضبیہ عقلیہ کے تین ۳ درجات

ان قوتوں میں سے ہر ایک کے تین اطراف ہیں (۱) افراط۔ (۲) تفریط (۳) اعتدال مجموعی طور پر ۹ نو قسمیں ہو جاتی ہیں

قوتِ شہویّہ کا افراط

چاہت کی قوت کا افراط یہ ہے (صَرفُہَا فِی مَا لَا یَنبَغِی) کہ اس قوت کو غیر مناسب جگہ استعمال کیا جائے۔ مثلاً چاہت میں حلال وحرام کی تفریق کئے بغیر جانوروں کی طرح جہاں طبیعت اور جی نے چاہا منہ مار لیا اکل کی قوت کو حلال کے بجائے حرام میں اور شرب (پینے) کی قوت کو شراب پینے میں اور قوتِ جماع کو نکاح کے بجائے زنا میں صرف کیا جائے اسی کو قوت شہویّہ کا افراطی پہلو کہتے ہیں اور اسی درجہ کو فجور بھی کہا جاتا ہے جس کے معنی کھلی نافرمانی کے ہیں اور افراط کے معنی زیادتی کے ہیں۔

قوتِ شہویّہ کا درجہ تفریط

انسان میں فطرتاً چاہت کی جو طاقت ہے اس کا ایک تفریطی پہلو بھی ہے جس کی تعریف یوں ہے

ترك الصرف مطلقاً فيما ينبغي وفيما لا ينبغي۔ یعنی چاہت کی قوت کو مناسب اور نامناسب دونوں جگہ خرچ نہ کیا جائے۔

اسی درجہ کو جمود کہا جاتا ہے اگر کھانے پینے اور دیگر حاجتوں کو بالکل ترک کر دیا جائے تو اس سے نقصان کا خطرہ ہے اسی لئے شرعاً یہ ترک کوئی پسندیدہ امر نہیں ہے بلکہ ضروریاتِ زندگی کا ترک خلافِ سُنت بھی ہے۔

قوتِ شہویّہ کا درجہ اعتدال

قوتِ شہویہ میں فجور اور جمود کے درمیان اعتدال کا درجہ ہے اس فطری طاقت میں اعتدال کا معنی یہ ہے کہ یہ قوت مناسب مواقع میں صَرف ہو اور غیر مناسب مواقع میں صَرف نہ کی جائے علم الاخلاق کے لحاظ سے اس کا نام عفت ہے عرف

عام میں گو عفّت پاکدامنی کو کہتے ہیں مگر اخلاق کی اصطلاح اس سے عام ہے۔ عرف میں تو صرف زنا سے بچنے کا نام عفت ہے لیکن اخلاق کی اصطلاح میں صرف زنا ہی سے نہیں بلکہ ہر شرعی نامناسب یعنی حرام سے اجتناب کا نام عفت ہے۔ یہاں ایک بات یہ بھی معلوم ہو گئی کہ قوت شہویہ میں افراط (زیادتی) تفریط (کمی) دونوں ہی مذموم ہیں جبکہ اس میں اعتدال محمود (قابل تعریف) ہے۔

قوت غضبیہ کا افراط۔ تفریط۔ اعتدال

قوتِ غضبیہ کا درجہ افراط یہ ہے۔

صَرْفُهَا فِیْ مَا لَا یَنْبَغِیْ ۔ (یعنی نامناسب امور میں اسے لگا دیا جائے مثلاً کسی مسلمان پر بلا وجہ قوتِ غضبیہ کا استعمال کرنا جہاں اس میں داخل ہے وہاں خودکشی بھی اسی میں شامل ہے یوں ہی اکیلا صرف ایک آدمی کا دشمن کی فوج پر حملہ کر دینا بھی قوتِ غضبیہ کا افراط ہے اسلام میں اس کی اجازت اس لیے نہیں دی گئی کہ جان کا خطرہ ہے اور کامیابی کا احتمال نہیں اسی درجہ کو تہوّر (غصے میں حد سے نکل جانا) کہا جاتا ہے قوتِ غضبیہ کا ایک اور درجہ ہے۔ جو تفریط (کمی) ہے اس کا معنی عَدَمُ الصَّرْفِ فِیْمَا یَنْبَغِیْ وَفِیْمَا لَا یَنْبَغِیْ۔ (یعنی مناسب اور غیر مناسب دونوں جگہوں پر اس کا استعمال نہ کیا جائے۔ اس درجہ کو جبن، (بزدلی) کہا جاتا ہے جو اخلاقِ مذمومہ میں سے ہے مثال کے طور پر ایک زمانے میں گاندھی جی نے تحریک چلائی تھی جس کو انسا تمی کہا جاتا تھا کہ مار کھاؤ۔ اسلام جو دین فطرت ہے اس کی اجازت نہیں دیتا کہ آدمی مار کھاتا رہے اور آگے سے چوں بھی نہ کرے یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے جس کی اجازت دین فطرت کیسے دے سکتا ہے؟ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ کا قول ہے۔

مَنِ اسْتُغْضِبَ فَلَمْ یَغْضَبْ فَهُوَ حِمَارٌ وَمَنِ اسْتُعْتِبَ وَلَمْ یَسْتَعْتِبْ فَهُوَ حِمَارٌ۔

(جس کو غصہ دلایا جائے پھر اس کو غصہ نہ آئے تو وہ گدھا ہے اور جس کو عتاب کیا جائے پھر اس کو

جوش نہ آئے تو وہ گدھا ہے) اسلام کی تعلیم اس ضمن میں یہ ہے

مَنِ اعْتَدٰی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدٰی علیکم۔ جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اتنی کر سکتے ہو جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہے۔

اور اگر کوئی معاف کرے تو یہ اس کا پرائیویٹ (ذاتی) معاملہ ہے جس کی اجازت دی گئی ہے۔ مثلاً قانونِ قصاص بھی اس کی نظیر ہو سکتی ہے اگر ولی اور ورثاءِ مقتول قاتل کو معاف کرنا چاہیں یا دیت کے طالب ہوں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں لیکن قانون ان کو عفو پر مجبور نہیں کرتا ان کی مرضی ہے قوتِ غضبیہ کا ایک درجہ تہوّر اور جبن کے درمیان ہے۔ اور وہ اس قوت کا اعتدال ہے اس کی تعریف یوں ہے صَرْفُهَا فِيمَا يَنْبَغِي (مناسب محل میں غصہ آئے) اور غیر ضروری مواقع پر نہ آئے اس درجہ کا نام شجاعت ہے مثلاً جہادِ اسلامی میں قوتِ غضبیہ کو کام میں لایا جائے اسلامی تاریخ کے عظیم جرنیل سَيْفٌ مِّنْ سُيُوفِ اللّٰهِ۔ حضرت خالد بن ولید نے قیصر و کسریٰ کی طاغوتی طاقتوں کے پرخچے اڑا دیئے۔ اور ہر میدان میں کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیئے لیکن موصوف نے اپنی اسلامی زندگی میں کسی مسلمان کو ایک تھپیڑ بھی نہیں مارا قرآنِ پاک میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی یہی تعریف آئی ہے۔ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ۔ (آپس میں مسلمانوں کے سامنے تو موم تھے جبکہ کافروں کے سامنے ایک مضبوط چٹان سے بھی سخت)

قوت عقلیہ کا درجہ افراط۔ تفریط۔ اعتدال

قوت غضبیہ کی طرح قوت عقلیہ کے بھی تین درجے ہیں۔ اس قوت میں درجۂ افراط کی تعریف یوں ہے ھو تحصیل علوم الضارہ۔ (نقصان دہ علوم کے حصول کا نام قوت عقلیہ کا افراط ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ خالقِ کائنات نے انسان کو قوتِ عقلیہ اس لئے عطا کی ہے۔ کہ وہ دین اور دنیا کے فائدے مند علوم کو سیکھے۔ اور نقصان دہ علوم سے اجتناب کرے

لیکن اگر کوئی شخص علوم نافعہ کی تحصیل کو ترک ہی کر دے۔ اور علوم ضارّہ کی تحصیل کو اپنا مقصد بنا لے۔ تو یہ قوتِ عقلیہ کا درجۂ افراط ہے، جو مذموم ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا نام ابلیسیّت ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کل مغربی علوم کے دلدادہ اور عاشق جو دینی علوم سے متنفّر ہیں وہ مجسّم ابلیس ہوتے ہیں۔

یورپ کے قابل تعریف علوم اور یورپی ابلیسیّت

یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ

یورپ کے پاس دو قسم کے علوم ہیں۔

(۱) صنعتی علوم۔ یعنی صنعتی ترقیات کے ضمن میں مثلاً سوئی سے لے کر ایٹم بم، تک یورپ نے جو ترقی کی ہے۔ ہم اس کے مخالف نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صنعتی علوم کا حصول نہ صرف جائز بلکہ فرض ہے۔ دراصل یہ ہمارے اپنے گھر کی ایک گم شدہ چیز ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ارشاد ہے (کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن فاین ما وجدہ ھو احق بھا) (کام کی بات ایک مومن کی گم کردہ چیز ہے تو وہ اس کو جہاں بھی پائے۔ اس کا وہ زیادہ حقدار ہے) اور قرآن پاک میں ایک جگہ ارشاد ہے۔ وعلّمناہ صنعۃ لبوسٍ لکم لتحصنکم من باسکم فھل انتم شاکرون۔ (اور ہم نے حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ بنانے کی صنعت تمہارے فائدے کے لئے سکھلائی تاکہ وہ تم کو لڑائی میں ایک دوسرے کی زد سے بچائے سو تم کیا اس نعمت کا شکر کرو گے؟)

یورپ کے پاس دوسری چیز علوم تہذیبیہ ہیں ہم یورپ کی تہذیب کو ابلیسیّت کہتے ہیں۔ یورپین تہذیب کا ترک کرنا فرض ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیریوں کی جا سکتی ہے۔ کہ یورپ کے پاس ایک تو صنعت کاری ہے۔ جسے مسلمان اپنا سمجھ کر اپنا سکتے ہیں۔ اور دوسری چیز یورپ کے پاس گناہ گاری ہے۔ جس سے اجتناب مسلمانوں پر فرض

ہے۔ آج کل ہمارے معاشرے کی حالت یہ ہے۔ کہ یورپ کی یونیورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کرنے کے باوجود سوئی بنانے کی بھی طاقت نہیں رکھتے جبکہ اپنا ڈھانچہ انگریزی بنانے میں اور ان کی تہذیب کو اپنانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ ہم اسی کو ابلہیت کہتے ہیں۔

قوتِ عقلیہ کا ایک درجہ تفریط کا ہے جس کی یوں تعریف کی جاسکتی ہے۔

ھو ترکُ تحصیل العلوم النّافعۃ (یعنی دین دنیا میں جو علوم فائدہ مند ہیں ان کی تحصیل بھی چھوڑ دی جائے۔) علوم نافعہ میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علوم شامل ہیں اب اگر ایک آدمی دین و دنیا کے تمام علوم کو ترک کر دے گا تو یہ عقلی قوت کی تفریط ہوئی اسی کا نام جہالت ہے جس کو ہر کوئی قابلِ مذمت گردانتا ہے۔ قوّت عقلیہ میں قابل تعریف درجۂ اعتدال ہے یعنی علوم نافعہ کو حاصل کیا جائے اور علوم ضارّہ سے بچا جائے اس میں دین و دنیا کے تمام فائدہ مند علوم شامل ہیں۔ علوم کے حصول میں یہ راہ اعتدال ہے اخلاقیات کی اصطلاح میں اس کو حکمت کہا جاتا ہے حکمت کے معنی سمجھ کے ہیں سنّت کو بھی حکمت کہا گیا ہے قرآنِ پاک میں ارشاد خداوندی ہے۔

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا۔ (اور جس کو حکمت دی گئی تو اس کو بہت بھلائی دی گئی) ایک لطیفہ ہے بلکہ غلیظہ کہنا مناسب ہوگا کہ بعض لوگوں نے حکمت سے مراد صدرا، شمس بازغہ اور یونانی فلسفے کی دیگر کتب کو سمجھا ہے جو قطعاً غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ بلکہ اصل صورتِ حال یوں ہے کہ حبرُ الاُمّۃ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے جب پوچھا گیا کہ حکمت کیا ہے؟ تو آپ نے جواباً فرمایا

اِتقان العلم والعمل۔ (علم و عمل کی مضبوطی) جس کا خلاصہ وہ ہی ہے کہ نفع مند علوم سیکھے جائیں اور نقصان دہ علوم سے اجتناب کیا جائے دنیوی علوم کے ضمن میں خُذْ مَا صَفَا وَ دَعْ مَا کَدَرَ

صاف لے لو اور گدلا چھوڑ دو) کے اصول پر عمل کرنا چاہیئے اسی لئے میں کہتا ہوں
یورپی تہذیب چھوڑنی چاہیئے اور ان کے صنعتی علوم حاصل کرنے ضروری ہیں،
و اصل میں ہمارے اپنے ہیں۔

تینوں قوتوں میں اعتدال کے لیے ایک چوتھی قوت کی ضرورت

قوت شہویہ۔ غضبیہ۔ عقلیہ کے درجات اور تفصیلات کے بعد یہ جاننا چاہیئے
قوت شہویہ میں اعتدال کا نام عفّت ہے جبکہ قوتِ غضبیہ میں اعتدال کا نام شجاعت
ہے اور قوتِ عقلیہ میں اعتدال کا نام حکمت ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ
قوتِ شہویہ۔ غضبیہ۔ عقلیہ۔ تینوں کو افراط و تفریط سے بچانے کے لئے ایک خُلق
رابع کی ضرورت ہے جس کا نام عدالت ہے یہاں عدالت کا معنیٰ یہ
گا کہ وہ قوت جو تینوں طاقتوں کو اعتدال پہ رکھتے ہوئے افراط تفریط سے بچائے
عدالت کا معنی صرف انصاف ہی نہیں ہے۔ مندرجہ بالا بحث میں ہم نے اخلاقی
قوتوں کی نو صورتیں بیان کی ہیں۔ جن میں تین درجہ افراط کی صورتیں ہیں اور تین
تفریط کی اور تین درجۂ اعتدال کی ہیں اور پھر دسویں چیز کا نام عدالت ہے جس کا
نام یہ ہے کہ کوئی قوت نہ تو افراط کی طرف جائے اور نہ تفریط کی طرف بلکہ ان قوتوں
کو اعتدال پہ قائم رکھے۔

یونانی فلسفہ اخلاق کی کتب اور اسلامی اخلاق

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے
علماء نے اخلاق کے موضوع پر جو کتابیں لکھی ہیں ان کی بنیاد یونانی فلسفۂ اخلاق پہ
ہی رکھی گئی ہے۔ اگرچہ ایک حد تک اخلاقیات میں اصولی مباحث کی سطح تک یہ اپنی
جگہ درست بھی ہے۔ لیکن ہو بہو یونانی فلسفۂ اخلاق کو موضوع بنا لینے کی کوتاہی کا

احساس ہم کو ضرور ہے۔ محققین علمائے اسلام میں سے جن بزرگوں نے اخلاقیات پر مستقل بحث کی ہے۔ ان میں سرفہرست حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی ہے چنانچہ احیاء العلوم میں اخلاقی مباحث کو انہوں نے خوب بیان کیا ہے۔ یوں ہی ابوعلی مسکویہ نے کتاب الطہارت میں اس موضوع پر لکھا ہے۔ ابو طالب مکی نے قوت القلوب میں اخلاقیات پر بحث کی ہے۔ امام غزالی کی احیاء العلوم کا ماخذ بھی کتاب ہے باقی طوسی نے اخلاق ناصری میں اور جلال الدین دوّانی شافعی نے اخلاق جلالی میں اور تفسیر حسینی کے مصنف (جو عارف جامیؒ کے مرید تھے) نے اخلاق محسنی میں اپنے تمام بیانات کی بنیاد فلسفۂ اخلاقِ یونانی پر رکھی ہے۔ ہمارا خیال ہے۔ کہ دور حاضر میں ان کتابوں پر نظر ثانی کی جائے اور قرآنی اور حدیثی اخلاقیات کو واضح طور پر ان میں سمویا جائے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ہُو بہو یونانی فلسفۂ اخلاق کو بیان کریں بلکہ قرآن و حدیث کے بیان کردہ اخلاقیات کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ اسلامی اخلاق کی بنیاد قرآن و سنت ہی ہو سکتی ہے۔

اسلامی اخلاق کی بنیاد صفت حیاء پر ہے

جمع الفوائد میں ایک حدیث قدسی ہے۔ فرمایا تَخَلَّقُوا بِاَخلَاقِ اللّٰہِ۔ (اللہ کے اخلاق اپناؤ) اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا جلوہ اپنے اندر بھی پیدا کرو۔ اور ان صفات کے نتائج و اثرات بندگی کی حد تک اپنانے کی کوشش کرو۔ تاکہ ایک عبد (غلام) کو اپنے معبود کے ساتھ تعلق اور ربط پیدا ہو جائے۔ اس حدیث کی اور علم الاخلاق کی پوری تشریح المقصد الاسنیٰ فی شرح اسماء الحسنیٰ میں کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اسلام میں اخلاق کی اصل بنیاد صفت حیا ہے۔ جس کو یونانیوں نے نظر انداز کیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کی تفصیلات بیان کرنا لازمی ہیں۔

صفت حیا کی تعریف

حدیث میں حیا کو نصف الایمان اور ایک روایت میں پورا ایمان قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک حیا کی تعریف یوں ہے ھی کیفیۃ راسخۃ فی النفس تمنع عما تذم شرعًا وعقلاً او عرفًا

جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ صفت حیاء نام ہے نفس ناطقہ کی اس مضبوط کیفیت کا جو ایک انسان کو مذموماتِ شرعی عقلی اور عرفی سے روکنے کا سبب بنے یعنی جو امور شرعی نکتۂ نظر سے برے ہیں یا عقلی نکتۂ نظر سے برے ہیں یا عرفِ عام میں برُے سمجھے جاتے ہیں۔ ان تینوں قسم کی برائیوں سے ایک انسان کو جو طاقت بچاتی ہے اس کو اسلام میں حیا کا نام دیا گیا ہے۔

حیا اور جُبن میں فرق

بعض لوگوں پر حیاء اور جبن (بزدلی) میں فرق مشتبہ ہو جایا کرتا ہے حالانکہ دونوں میں واضح فرق موجود ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا کہ ان تینوں مذمومات (برائیوں) سے جو روکے وہ حیاء ہے اور جو افعال ان مذموماتِ ثلاثہ میں داخل نہیں بلکہ وہ صفاتِ حسنہ میں شامل ہیں ان سے رُکنے کا نام جُبن ہے مثلاً ایک ظالم کسی کا مال اگر چھینتا ہے اور مظلوم اس کی مدافعت نہیں کرتا تو یہ جُبن ہے اگرچہ وہ مظلوم یوں سمجھتا ہو یا کہتا ہو کہ میں شرماتا ہوں یہ حیاء و شرم نہیں بلکہ بزدلی ہے اس طرح اگر کسی کو کہا جائے کہ تم کمشنر یا کسی بڑے افسر سے مل کر عوامی فائدے کی بات کرو اور وہ بات کرنے میں جھجک محسوس کرے یا بالکل نہ جائے تو یہ حیاء نہیں بلکہ جُبن ہے اس لئے کہ کمشنر سے عوامی فوائد کی بات کرنا یا اس کے پاس جانا نہ عقلاً برا ہے نہ عرفاً نہ شرعاً۔ بقول حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ حیاء و شرم انسان کے ساتھ خاص ہے۔ حیوانات میں یہ صفت نہیں

ہوتی یہی وجہ ہے کہ انکشافِ ستر بالمجامعت جہراً میں حیوان جھجک محسوس نہیں کرتا جبکہ انسان خواہ کافر ہی ہو جھجک محسوس کرتا ہے اور اگر کوئی انسان سڑک پر ایسا کام کرے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس میں حیاء ختم ہو چکی ہے اور وہ انسانی دائرہ سے نکل کر جانوروں کے دائرہ میں داخل ہو گیا ہے۔ اسلئے اسلام میں حیاء کی بڑی اہمیت ہے مشہور حدیث ہے اَلْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ۔ (شرم ایمان کا ایک حصّہ ہے) اور فتح الباری میں اِیْمَانٌ کُلُّہٗ بھی مروی ہے (حیاء پورا ایمان ہے) ایمان کا کام ہے کہ انسان کو مذموماتِ ثلاثہ سے روکے اور یہی کام حیاء کا ہے اس لئے حدیث میں حیاء کو ایمان کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے۔

سورہ فاتحہ سے اخلاق کا استنباط

اب سورہ فاتحہ سے اخلاق کا استنباط کیا جاتا ہے سورہ فاتحہ

خلق اوّل کا پہلا کلمہ ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں) اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ محمودِ خلائق ہے اور محمود کا مقابل مذموم ہے چونکہ ہمارا خدا محمود ہے جس کی تعریفیں ساری مخلوق کرتی ہے تو حدیث تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ (اللہ تعالیٰ کی صفات اپناؤ) کے مطابق ہم کو محمود بننا چاہیئے نہ کہ مذموم یعنی ہم سے ایسے افعال صادر ہوں جن کی مخلوقِ خدا تعریف کرے اور افعالِ مذمومہ سے اجتناب کیا جائے جن کی لوگ مذمت اور برائی بیان کریں۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم وصفِ حیاء سے متصف ہوں یعنی ہمارے اندر خلق حیاء ہو جس کی وجہ سے مذموماتِ شرعیہ۔ عرفیہ۔ عقلیہ۔ سے آدمی بچ جائے الغرض اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے صفتِ حیاء کا استنباط ہوا جو اخلاق میں ایک عظیم خلق ہے۔

خلق ثانی

سورۃ فاتحہ میں دوسرا جملہ ہے رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (جہانوں کی تربیت کرنے والا) اسلامی اخلاق میں ایک بڑا خلق احسان بھی ہے مگر یونانیوں نے احسان کے بجائے سخاوت کا ذکر کیا ہے جبکہ احسان جامع لفظ ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان احسان کا بندہ (غلام) ہوتا ہے۔ احسان کے ذریعہ بہت بڑی سرکش قوت بھی نرم ہو جاتی ہے۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیتِ عامہ ذکر فرمائی گئی ہے کہ وہ ہر ایک کی تربیت فرماتا ہے اسی کا نام احسان ہے یہ صفت بھی ہم کو اپنانی چاہیئے رب العلمین میں اخلاقیات میں سے صفتِ احسان کا استنباط ہوتا ہے۔

خلق ثالث

تیسرا جملہ سورہ فاتحہ کا الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (مہربان نہایت رحم کرنے والا) ہے گویا یہ تیسری صفت ہوئی اللہ تعالیٰ کی اس کا مفہوم ہوا شفقت (عَلَى الْخَلْقِ) (مخلوق پر شفقت ظاہر ہے کہ مخلوق صرف انسان ہی نہیں بلکہ دیگر ساری کائنات بھی مخلوق ہے۔ تو ہمارا خدا رحمتِ عامہ کے ساتھ موصوف ہے اس لئے ہمیں بھی مخلوقِ خدا پہ شفقت کرنی چاہیئے۔ مخلوق پہ شفقت کی دلیل وہ حدیث بھی ہے جس کا مضمون یوں ہے کہ ایک بدعمل عورت صرف اس لئے بخش دی گئی کہ اس نے اپنا موزہ اتار کر ایک پیاسے کتے کو کنویں سے پانی نکال کر پلایا تھا اور ایک دوسری عورت کو اس لئے عذاب میں مبتلا کیا گیا کہ اس نے ایک بلی کو باندھے رکھا تھا نہ اس کو خود خوراک دی اور نہ ہی کھول کر اس کو آزاد کیا کہ بلی خود اپنے کھانے کا انتظام کرتی یہاں تک کہ وہ بلی یوں ہی مر گئی۔ ان دونوں حدیثی واقعات سے اسلام میں شفقت کی اہمیت اور عدم شفقت کا جرم عظیم ہونا معلوم ہوتا ہے۔

خلق رابع

(مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ) (انصاف کے دن کا مالک ہے) اس آیت میں جو خلق سمجھے خلق عدل و انصاف کا پتہ چلا کہ

ہمارا خدا عادل ومنصف ہے اس لئے یہ صفت ہم کو بھی اپنانی چاہیئے جس کی صورت یہ ہوگی کہ اگر ہم گواہ ہوں تو سچی گواہی دیں اور اگر ہم جج ہوں تو انصاف سے فیصلے کریں اور اگر کوئی انتظامی عہدے دار ہوں تو عدل وانصاف کا دامن چھوٹنے نہ پائے رشوت یا صرف رشتے داری اور سفارش کو اپنے فیصلوں کی بنیاد نہ بنائیں سورہ فاتحہ میں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اس کا ماخذ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ عدل کا ظہور قیامت میں ہوگا۔ اور دنیا میں بھی اس کی صفت قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (انصاف پر قائم ہے) ہے بندوں کا فرض ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ تعالیٰ شانہٗ کی شانِ عدل کا خیال رکھیں۔

خُلقِ خامس

اِيَّاكَ نَعْبُدُ (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں) پانچواں خُلق تواضع ہے یعنی بندگی کا اظہار واقرار کرنا یہاں اس کو بیان فرمایا ہے تواضع کا مقابل تکبّر ہے جو شرعًا ممنوع ہے۔ حدیث میں ہے لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ كِبْرٍ۔ (وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی کبر ہوگا) قرآنِ پاک میں ارشاد خداوندی ہے وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ۔ (اور اللہ تعالیٰ ہر متکبر بہت فخر کرنے والے کو پسند نہیں فرماتے) اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں بتایا گیا ہے کہ ہماری حیثیت عبد کی ہے اور عبد (بندہ) مامور من اللہ ہوتا ہے اور حکمِ خداوندی کی تعمیل جب ہوگی کہ انسان میں تواضع کی صفت ہو نماز بھی عبادت کا ایک رکن ہے اس میں بھی تواضع کا ظہور ہوتا ہے کہ ہم چہرہ اور پیشانی اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے زمین پر رکھ دیتے ہیں نماز میں تواضع کی عادت پڑتی ہے جو اخلاقِ حسنہ میں سے ایک خُلق ہے۔

اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

خلق سادس (ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں) اس میں چھٹا خُلق قناعت کی تلقین فرمائی گئی ہے قناعت کا یہی مطلب ہے کہ اے اللہ صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ اور اس میں حصر بھی ہے اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہماری ہر طمع اور امید کا مرکز صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہوگی اس لئے مخلوق سے بے نیاز ہو کر اللہ ہی کو اپنا قاضی الحاجات ، سمجھنا چاہیئے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ایک قانع غنی ہوتا ہے جبکہ طامع مسکین و فقیر ہے اگرچہ طامع کروڑپتی ہی کیوں نہ ہو اس کا پیٹ نہیں بھرتا ایک حدیث میں ہے

لَوْکَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِیَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغٰی ثَالِثًا وَلَا یَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ اٰدَمَ اِلَّا التُّرَابُ وَیَتُوْبُ اللّٰہُ عَلٰی مَنْ تَابَ۔ (اوکما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام)

اگر اولادِ آدم کے پاس دو میدان مال و دولت سے بھرے ہوئے موجود ہوں تو وہ تیسرے میدان کی تلاش میں ہوتا ہے اور اولادِ آدم کے پیٹ کو (قبر کی) مٹی ہی بھرے گی اور اللہ کی رحمت تو اس کی طرف دھیان دینے والے پر ہی ہوگی)

قناعت پر ایک واقعہ

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو دین میں یہ بلند مقام کیسے حاصل ہوا؟ جواباً فرمایا کہ ایک غلام کی وجہ سے یہ نعمت عطا ہوئی واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک مرتبہ بغداد میں قحط پڑ گیا لوگوں کا بھوک سے بُرا حال ہو رہا تھا اور بہت پریشان تھے ان حالات میں ایک غلام کو میں نے دیکھا کہ وہ ہنس رہا ہے اور خوشی سے پھول رہا ہے میں نے غلام سے اس کا سبب پوچھا کہنے لگا بات یہ ہے کہ میں جس آدمی کا غلام ہوں وہ کئی گاؤں کا مالک ہے اور اس کے پاس سینکڑوں من غلہ محفوظ ہے اس لئے بھوک سے مرنے کا مجھے ڈر نہیں کیا ان حالات میں مجھے اپنی حالت پر خوش نہیں ہونا چاہیئے؟ میں نے

سوچا کہ جب یہ غلام ایک آدمی کی وجہ سے خوش ہے جبکہ وہ بھی خدا کا بندہ ہے تو میں غنیٔ مطلق کا غلام ہو کر بے چین و پریشان کیوں ہوں ؟ جس کے پاس کائنات کے خزانے ہیں مجھے اس پہ یقین رکھتے ہوئے قناعت کا سبق سیکھنا چاہیئے یعنی طمع اور امید کا مرکز صرف ربّ العلمین کی ذات کو سمجھنا چاہیئے۔

خلق سابع

سورۂ فاتحہ میں ساتواں جملہ ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (ہم کو سیدھی راہ پہ چلا) اس آیت میں ساتواں خُلق بیان فرمایا گیا ہے اور وہ ہے صحیح علم و حکمت اگر علم ہی غلط یعنی ضال ہو تو اس سے روشنی کہاں آئے گی اسی کو میں ابلیسیت کہا کرتا ہوں جیسے کہ دورِ حاضر کے اکثر علوم کا حال ہے کہ ان علوم سے لوگوں کے اعمال میں بگاڑ عقائد میں تزلزل پیدا ہوتا ہے اور اگر ایک آدمی کو علوم ضالہ اور غیر ضالہ دونوں ہی حاصل نہ ہوں تو یہ جہالت ہے جو دوسری مصیبت ہے جس سے پناہ مانگنی چاہیئے الغرض یہاں ہم کو یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ اے اللہ ہم کو علم و حکمت عطا کر جو صراط مستقیم ہے اور علم و حکمت بھی وہ جو انعام یافتہ لوگوں والی ہے ـــــ مَغضُوبین اور ضالّین کے پاس علم و حکمت نہیں بلکہ ابلیسیت ہے۔

حکمت کی تعریف

جلال الدین دوّانی نے حکمت کی تعریف یہ کی ہے کہ جس علم سے جان اور روح میں نور پیدا ہو وہ حکمت ہے اور علم نافع ہے اور جس علم سے صرف تن میں اضافہ ہو اور روح میں روشنی کے بجائے ظلمت پیدا ہو تو ایسا علم نافع کیا ہو گا وہ تو زہر اور نقصان دہ ہے کیا خوب کہا گیا ہے۔ علم چوں بر جاں زنی یارے بود۔

(علم روح کی اصلاح کرے تو یہ ایک یار اور دوست ہے)

علم چوں بر تن زنی مارے بود۔

(علم جب صرف تن آسانی کے لئے ہو تو یہ سانپ ہے)

حقیقت یہ ہے کہ سارے دین کا خلاصہ عشق الٰہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات سے ایسا لگاؤ پیدا ہو جائے جیسے کہ ایک بھوکے اور پیاسے کو کھانے اور پانی سے ہوتا ہے اسی کو یوں کہا گیا ہے۔

علمِ نبوت غیر علمِ عاشقی

ما بقی تلبیس ابلیس شقی

(۴)

سورۂ فاتحہ کی معاشرتی تفسیر

معاشرتی تفسیر سے قبل معاشرہ کی حقیقت اور تعریف معلوم ہونی ضروری ہے تا کہ سورۂ فاتحہ سے جو اصول نکلیں ان کا سمجھنا آسان ہو۔

معاشرہ کی لفظی تحقیق اور تعریف

معاشرہ عشر سے نکلا ہے اور عربی میں عشر دس کو کہا جاتا ہے امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں لکھا ہے کہ عرب جب کہتے ہیں عَاشَرْتُهٗ (میں نے اس کے ساتھ گذران کیا) اس کا معنی ہوتا ہے اے صِرْتُ لَہٗ کَالْعَشَرَۃِ۔ (یعنی میں دس مددگاروں کے برابر ہو گیا) اسی معاشرہ سے لفظ عشیرۃ نکلا ہے یعنی کنبہ اور قبیلہ چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (اور آپ اپنے قبیلے کے قریبی رشتہ داروں کو آگاہ کیجئے) معاشرہ کی تعریف یوں ہے حَیَاتُ الْاِنْسَانِ مَعَ الْجَمَاعَۃِ سَوَاءٌ کَانُوْا مِنَ الْاَقَارِبِ اَوِالْاَجَانِبِ (انسان کا جماعتی زندگی گذارنا

(علم جب صرف تن آسانی کے لئے ہو تو یہ سانپ ہے)

حقیقت یہ ہے کہ سارے دین کا خلاصہ عشق الٰہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات سے ایسا لگاؤ پیدا ہو جائے جیسے کہ ایک بھوکے اور پیاسے کو کھانے اور پانی سے ہوتا ہے اسی کو یوں کہا گیا ہے۔

علم نبوت غیر علم عاشقی

ما بقی تلبیس ابلیس شقی

(۴) سورۂ فاتحہ کی معاشرتی تفسیر

معاشرتی تفسیر سے قبل معاشرہ کی حقیقت اور تعریف معلوم ہونی ضروری ہے تاکہ سورۂ فاتحہ سے جو اصول نکلیں ان کا سمجھنا آسان ہو۔

معاشرہ کی لفظی تحقیق اور تعریف

معاشرہ عشر سے نکلا ہے اور عربی میں عشر دس کو کہا جاتا ہے امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں لکھا ہے کہ عرب جب کہتے ہیں عَاشَرْتُہٗ (میں نے اس کے ساتھ گذران کیا) اس کا معنی ہوتا ہے اے صِرْتُ لَہٗ کَالْعَشَرَۃِ۔ (یعنی میں دس مددگاروں کے برابر ہو گیا) اسی معاشرہ سے لفظ عشیرۃ نکلا ہے یعنی کنبہ اور قبیلہ چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (اور آپ اپنے قبیلے کے قریبی رشتہ داروں کو آگاہ کیجئے) معاشرہ کی تعریف یوں ہے حَیَاتُ الْاِنْسَانِ مَعَ الْجَمَاعَۃِ سَوَاءٌ کَانُوْا مِنَ الْاَقَارِبِ اَوْ اَجَانِب (انسان کا جماعتی زندگی گذارنا

یہ جماعت چاہے رشتہ داروں کی ہو یا دوسروں کی) یا معاشرہ کی تعریف یوں بھی کی جا سکتی ہے۔ حُسْنُ السُّلُوكِ إِلَىٰ مَنْ كَانَ مِنَ الْأَقَارِبِ أَوِ الْمَعَارِفِ (رشتہ داروں سے یا دیگر جاننے والوں سے اچھا سلوک کرنا) قرآن پاک میں ایک جگہ عورتوں سے حسن سلوک کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہے۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (اور ان سے دستور کے مطابق اچھا سلوک کرو)

متکلمین کے نزدیک معاشرہ کی تعریف

ہمارے متکلمین نے معاشرہ کی تعریف یوں کی ہے الجماعة المشتركة في الوطن او القرية او البلد او الصحبة (معاشرہ اس جماعت کا نام ہے جو وطن میں شریک ہوں یا کسی چھوٹی بستی میں یا بڑے شہر میں یا کسی کام میں شریک ہوکر فرائض انجام دینے والے دوست ہوں) یہ جامع تعریف ہے اس کے مطابق ایک گھر سے شروع ہوکر عالمی برادری تک اپنے اپنے درجے میں معاشرہ کے انواع و اقسام ہیں معاشرہ کی تعریف کے بعد سورۂ فاتحہ میں اصلاح معاشرہ کے اصول ملاحظہ ہوں۔

سورہ فاتحہ اور اصلاح معاشرہ کے اصول

ہم نے سورۂ فاتحہ کی معاشرتی تفسیر میں ان اصولوں کو بیان کرنا ہے جن سے افرادِ معاشرہ میں باہم تعاون و تناصر اور نظم و نسق پیدا ہو اور معاشرے میں اختلاف۔ نفرت۔ حسد۔ بغض کے بجائے پیار و محبت اخلاص پیدا ہو حقیقت یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ اوّل سے آخر تک کمالات الٰہیہ پر مشتمل ہے اور ان کمالات کا تعلق تمام انسانی افراد کے ساتھ ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

اَلنَّاسُ عِیَالُ اللّٰہِ فَاَحْسَنُہُمْ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عِیَالِہٖ۔
(لوگ اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہیں پھر ان میں بہتر وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ حسن سلوک کرے) الغرض جو برتاؤ اللہ تعالیٰ کا افرادِ انسانی کے ساتھ ہے وہ ہی برتاؤ افرادِ معاشرہ کا آپس میں ہونا چاہیئے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرہ کا بگاڑ ختم ہو جائے گا اصول حسب ذیل ہیں۔

الاصلُ الاوّل

معاشرہ کی اصلاح کے لئے پہلا اُصول اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ۔ میں بیان کیا گیا ہے جس کا معنی ہے کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں اس میں یہ سبق ہے کہ ہمارا خدا محمود ہے مخلوق اس کی تعریف کرتی ہے اب معاشرہ کی درستگی اور اصلاح اس میں ہے کہ تمام افراد اور شرکائے معاشرہ کا مقصد اور نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ محمودیّت کا مظہر بنیں یعنی اپنے عمل اور برتاؤ سے معاشرہ کے تمام افراد کی نگاہ میں محمود بننے کی فکر کریں مذموم نہ بنیں جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد وہ کام کرے جس پر لوگ مذمّت کے بجائے تعریف کریں یہ سبق ہم کو اللہ تعالیٰ کی محمودیت کے وصف سے ملا ہے جس کا ماخذ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ہے۔

الاصل الثانی

معاشرہ کی اصلاح کا دوسرا اصول احسان ہے اس کا ماٰخذ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہے (جہانوں کی تربیت کرنے والا) اس صفت سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ خدا کی ربوبیّت عامہ ہے اسی ربوبیت عامہ کو ہم نے احسان سے تعبیر کیا ہے جبکہ احسان کی تعریف ہے اِیْصَالُ النَّفْعِ اِلَی الْغَیْرِ۔ (کسی دوسرے کو فائدہ پہنچانا) اللہ تعالیٰ جب ربوبیّت عامہ کے ذریعہ تمام عالم کو فائدہ پہنچاتا ہے تو معاشرہ کے ہر فرد کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ ہر ایک کو فائدہ پہنچائے اور احسان کا سلوک کرے۔

دوسروں کے ساتھ احسان بنسبت اپنی ذات کے زیادہ مفید ہے

آج کل لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ ہمارا دوسروں پر حق ہے ہم پر کسی کا حق نہیں لیکن یہ نظریہ قرآنی نظریہ کے خلاف ہے قرآنِ پاک یہ تصور دیتا ہے کہ افرادِ معاشرہ کا ہر فرد مجسّم احسان ہونا چاہیئے اس ضمن میں امام رازی رحمۃ اللہ نے ایک نہایت معقول بات فرمائی ہے کہ مجموعہ افرادِ معاشرہ کے لئے اِحْسَان اِلَی الْغَیْرِ اس سے زیادہ مفید ہے کہ آدمی اِحْسَان اِلَی النَّفْس کی کاروائی کرے یعنی غیر کو نفع پہنچانا اپنی ذات کو نفع پہنچانے سے بہتر ہے امام رازیؒ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ مثال کے طور پر ایک معاشرہ میں پانچصد افراد شریک ہوں تو اگر ہر فرد کا یہ نظریہ ہو کہ صرف اپنی ذات کو نفع پہنچایا جائے دوسرے لفظوں میں ذاتی منفعت کو اجتماعی منفعت سے مقدم رکھا جائے تو اس صورت میں فائدہ صرف ایک ذات کو ہوگا لیکن اگر پانچ سو افراد کا نظریہ یہ ہو کہ دوسروں کے نفع کو اپنی ذات کے نفع سے مقدم رکھا جائے گا تو اس صورت میں ایک کم پانچ سو فائدہ اٹھائیں گے حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایسا معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے کہ جس میں افرادِ معاشرہ کا باہم تعاون مثالی ہو. میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے لئے یہ حقیقت باعثِ شرم ہونی چاہیئے کہ دنیا میں پارسی قوم ایسی ہے جس کا کوئی فرد بھی غریب نہیں ہوتا اس لئے کہ ان کا نصب العین ہی باہمی تعاون ہے اُن میں سے اگر کوئی غریب ہوتا ہے تو قوم کے مالدار افراد باہم چندہ کر کے اس کو تجارت میں لگا دیتے ہیں اور پھر وہ کما کر اصل رقم واپس کر دیتا ہے اس کی بنیاد احسان الی الغیر پہ ہے۔

اجتماعی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینا کائناتی فلسفہ ہے

اس حقیقت

کا انکار کون کر سکتا ہے کہ پوری کائنات کا نظام ہی اس پر چل رہا ہے کہ اجتماعی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دے کر ہی ذاتی فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے مثال کے طور پر ایک انسان ہاتھ پاؤں کی حرکت اور محنت سے غذا حاصل کرتا ہے جب کھانے پینے کا سامان تیار ہو جاتا ہے تو انسانی اعضاء میں سب سے پہلے مُنہ غذا سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ زبان غذا کو پیسنے کے لیے پلٹاتی ہے پھر یہ غذا حلق کے حوالے ہوتی ہے اور پھر حلق غذا کو معدے کے حوالے کر دیتا ہے وہاں غذا ہضم ہوتی ہے اس طویل چکر کے بعد غذا سے صاف خون پیدا ہوتا ہے یہ خون حسبِ مراتب انسان کے تمام اعضاء پر تقسیم ہوتا ہے اس تقسیم میں ہاتھ پاؤں کو بھی اپنا حصہ ملتا ہے لیکن کچھ تاخیر سے اگر ہاتھ پاؤں خود غرضی سے کام لیں اور اِیْصَالُ النَّفْعِ اِلَی الْغَیْرِ۔ (دوسرے کے فائدہ کو مقدم رکھنے) کے اصول پر عمل نہ کریں بلکہ اپنی کمائی کو صرف ذات تک ہی محدود رکھیں تو پھر غذا سے نہ خون پیدا ہوگا اور نہ ہی ہاتھ پاؤں تک خون پہنچے گا اس کے نتیجے میں سارا بدن کمزور ہو کر متأثر ہوگا اور ظاہر ہے کہ اس کمزوری کا اثر ہاتھ پاؤں پر بھی پڑے گا اسی طرح افراد کی خود غرضی کا برا اثر پورے معاشرہ پر پڑتا ہے پھر نتیجتاً خود غرض افرادِ معاشرہ بھی نقصان اٹھاتے ہیں اس مثال سے دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے فوائد معلوم ہوتے۔

دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا ایک عنوان ایثار بھی ہے

قرآن کریم میں ایک مقام پر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی خصوصی انداز میں تعریف فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ترجمہ: اور یہ صحابہ رسول اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود ضرورت مند ہوں) اس آیت میں بھی ایصال النفع الی الغیر (دوسروں

کو فائدہ پہنچانا) کو ہی بیان فرمایا گیا ہے اس کی وضاحت ایک مثال سے یوں ہوسکتی ہے مثلاً کسی ضرورت مند کو روٹی کھلانا ایصال النفع کی ایک صورت ہے لیکن اس کے بہت سے درجات ہیں سے ایک درجہ یہ ہے کہ اپنے پاس روٹی ہو تو خود بھی سیر ہو کر کھائے پھر ضرورت مند کو بھی کھلائے یہ احسان کا ادنیٰ درجہ ہے دوسرا درجہ یہ ہے کہ اپنے پاس کھانے کو نہیں اور معمولی بھوک بھی ہو پھر کہیں سے کھانا مل جائے تو خود کھانے کے بجائے دوسرے ضرورت مند کو کھلاوے یہ صورت پہلے درجہ سے بلند ہے سب سے آخری درجہ اور اعلیٰ مقام یہ ہے کہ اپنے آپ کو انتہائی درجہ کی بھوک ہو مگر اپنے بجائے دوسرے ضرورت مند کو دیدیا جائے اسی آخری درجہ کا نام ایثار ہے اور آیت کریمہ میں وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (اگرچہ خود ضرورت مند ہوں) کی قید لگا کر احسان کے اس آخری درجہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اس سے یارانِ رسول کی عظمت کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے آج کل تو دودھ والے مجنوں زیادہ ہیں جبکہ صحابہ کرام تو خون والے مجنوں تھے۔

اسلامی دور میں احسان و ایثار کی مثالیں

سورہ فاتحہ میں اللہ تعالےٰ کی ربوبیت عامہ کا ذکر فرمایا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اللہ رب العٰلمین کے دستر خوانِ نعمت سے ہر قسم کی مخلوق فائدہ حاصل کر رہی ہے۔ انسانوں کے علاوہ چرند و پرند۔ حیوان بری۔ بحری یوں ہی دیگر مخلوقاتِ ارضی و سماوی اور فضائی سب ہی فائدہ حاصل کر رہے ہیں پھر مزید برآں یہ کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ احسان کا مظاہرہ یوں بھی ہو رہا ہے کہ دوست و دشمن بغیر تفریق فائدہ اٹھا رہے ہیں تو بندوں کو اپنی شان کے مطابق شانِ خداوندی کا جلوہ اپنے اندر پیدا کرنا چاہیئے اور صفتِ احسان کا مظہر بنیں، ایک روایت میں ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرتبہ کئی دنوں کا

فاقہ تھا کسی نے دودھ کا پیالہ آپ کی خدمت میں پیش کیا آپ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلایا یہ بھی فاقے سے تھے ان سے آپ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے دیگر دوستوں اصحابِ صُفّہ کو بھی بلا لو چنانچہ سب بلائے گئے یہ لوگ آپ کی درسگاہ کے طلباء تھے جن کا کوئی مستقل ذریعہ معاش نہ تھا حافظ ابن قیمؒ کی تحقیق کے مطابق عام حالات میں اصحاب صُفّہ کی تعداد چار سَو تک ہوتی تھی جن میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ وہ دودھ اصحابِ صُفّہ کو دیا گیا جنہوں نے سیر ہو کر پیا پھر حضورِ اکرم نے حضرت ابوہریرہؓ سے فرمایا تم پیو حضرت ابوہریرہؓ پی کر سیر ہو گئے تو آپ نے پھر فرمایا ابوہریرہؓ اور پیو عرض کیا حضورؐ مَا وَجَدتُ مَسَاغًا (میں اپنے پیٹ میں جگہ نہیں پاتا) پھر سب سے آخر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ نوش فرمایا۔ اس نبیانہ طریق تقسیم نے مسلمانوں کو یہ نظریہ بخشا ہے کہ ایک مسلمان کسی حال میں بھی ذاتی غرض کو دوسروں کی غرض اور اجتماعی مفاد پر مقدم نہیں رکھ سکتا اور بڑوں کو اس پر عمل کرنا چاہیئے بعد کے اسلامی دور میں بھی اس کے نمونے ہم کو تاریخ کے صفحات پر نظر آتے ہیں چنانچہ دُنیا کے مشہور سیاح ابن بطوطہ نے سات سال کا طویل عرصہ ہندوستان کی سیاحت میں گذارا لیکن اس کی ایک کوڑی بھی خرچ نہ ہوئی جبکہ ہمراہ انسانوں کا ایک قافلہ بھی اس کے ساتھ رہتا تھا مگر ہر جگہ انتظام ہو جاتا تھا۔ آج کل تو یورپ کا یہ حال ہے کہ جب باپ بیٹے کے پاس جائے یا بیٹا باپ کے پاس جاتا ہے تو اپنے کھانے کا بل خود ادا کرنا ہوتا ہے۔

الغرض سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی صفت ربّ العالمین بتا کر دوسروں پر ایثار کرنے کا سبق دیا گیا ہے پھر عجیب بات ہے ربّ المسلمین یا ربّ المومنین نہیں فرمایا بلکہ ربّ العالمین یعنی پوری کائنات کی تربیت کرنے والا فرما کر یہ بھی سبق دیا ہے کہ ایثار و احسان میں مسلم غیر مسلم کا فرق بھی نہ ہونا چاہیئے خدا کی ربوبیتِ عامہ کا تقاضا یہی ہے (اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَ تَرْضٰی) علی اصغر

الاصل الثالث

شفقت علی الخلق۔ (مخلوق پر شفقت) اس اصول کا ماٴخذ ہے۔ الرحمٰن الرحیم (مہربان نہایت رحم کرنے والا) احسان میں اور شفقت میں فرق یہ ہے کہ شفقت کا معنی یہ ہے کہ دل میں درد ہو اور پھر حسن سلوک بھی کرے جہاں تک احسان ہے تو مصنوعی طور پر بھی کیا جاتا ہے جبکہ دل میں درد نہیں ہوتا اس کی مثال دورِ حاضر میں یہ ہوسکتی ہے کہ الیکشن کے موقعہ پر امیدوار و دیگر افراد ووٹروں کے لئے دیگیں پکواتے ہیں مگر یہ ایک مصنوعی احسان ہے شفقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں شفقت تو ایک باطنی جذبے کا نام ہے کہ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر انسان بے چین ہو جائے۔

شفقت کی مثالیں

اسلامی دور میں شفقت کی بے شمار امثلہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں مختصراً چند مثالوں کی طرف اشارہ مفید ہوگا۔ غزوۂ بدر میں گرفتار ہونے والے اسیروں میں حضرت عباس بن عبدالمطلب بھی تھے قیدیوں کو رسیوں سے باندھ گیا تھا ان کی گرفت سخت ہونے کی وجہ سے تکلیف ہوئی جس پر حضرت عباس کراہنے لگے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز سُنی تو بے چین ہو گئے فوراً اصحابہ کو بلا کر فرمایا کہ عباسؓ کو سخت جکڑا گیا ہے ان کی گرہ نرم کردی جائے مگر یاد رکھو یوں ہی دوسرے قیدیوں کی گرفت کو بھی نرم کر دیا جائے یوں ہی تاریخ میں سات واقعات ایسے درج ہیں کہ قاتل حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے آئے لیکن موقعہ پر مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ ان مجرموں کو جب آپ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپؐ نے شفقت فرما کر ان کو بری کر دیا ان میں سے ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک سفر میں آپ کسی درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے دشمن قتل کے ارادے سے سر پر آ گیا اور ننگی تلوار آپ کے مبارک سینے پر رکھ

دی اور دھمکی دیتے ہوئے کہنے لگا مَنْ یَّمْنَعُکَ مِنِّیْ ؟
(اب آپ کو مجھ سے کون بچائے گا ؟ لیکن آپ بالکل پریشان نہ ہوئے پیغمبرانہ یقین
کے ساتھ فرمایا اَللّٰہُ (کہ اللہ کی ذات بچانے والی ہے) اس کلمہ پر دشمن ایسا
مرعوب ہوا کہ ہاتھ سے تلوار گر گئی وہ تلوار آپؐ نے پکڑ لی اب موقعہ تھا کہ دشمن کا سر اسی
کی تلوار سے کاٹ دیا جاتا لیکن آپ نے شفقت فرماتے ہوئے معاف کر دیا۔ تیرہ
سال تک مکہ میں وہ کونسا ظلم تھا دشمنوں نے آپ پر اور آپ کے صحابہ پر جس کی مشق
نہ کی تھی لیکن ۸ھ میں فتح مکہ کے موقعہ پر ان جانی دشمنوں کو لَا تَثْرِیْبَ
عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ (آج تم پر کوئی گرفت نہیں ہے) فرما کر معافی کا تاریخی اعلان
فرما دیا۔ (اللہ تعالیٰ کے ان گنت درود و سلام ہوں آپ پر)

الاصل الرابع

اصلاح معاشرہ کا چوتھا اصول عدالت ہے جس کے
معنی انصاف کے ہیں اس کا ماخذ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۔ (انصاف
کے دن کا مالک ہے) ہے معاشرہ کی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ افرادِ معاشرہ
آپس میں انصاف و عدل سے کام لیں کوئی کسی کا حق نہ مارے معاشرہ کو سدھارنے کے
لئے قیام عدل ضروری ہے جہاں عدل نہ ہوگا وہاں بگاڑ پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہ ایک مسلمہ
حقیقت ہے کہ معاشرہ میں قوی اور طاقتور بھی ہوتے ہیں اور ضعیف بھی اگر ایک
طاقتور کسی کمزور کا حق غصب کرے گا تو پھر حق تلفی کا ایک نہ ختم ہونے والا
سلسلہ شروع ہو جائے گا الغرض معاشرہ کی اصلاح کے لئے عدل و انصاف کا قیام
لازمی امر ہے یہ سبق ہم کو سورۂ فاتحہ کی آیت مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ
نے دیا ہے جب ہمارا خدا اپنے بندوں میں ضرور انصاف کرے گا تو افرادِ معاشرہ
عدل و انصاف اپنا کر اصلاحِ معاشرہ میں ممد و معاون بننے کی فکر کریں۔

الاصل الخامس

اصلاح معاشرہ کے لئے ، پانچواں اصول ہے ۔

اَلْاِطَاعَۃُ لِمُسْتَحِقِّیْهَا (معاشرہ میں جو لوگ قابل اطاعت ہیں اُن کا کہا مانا جائے) اس کا ماخذ سورۃ فاتحہ میں جملہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ ہے ۔ جس کا معنی ہے کہ اے اللہ ہم آپ کی ہی عبادت کرتے ہیں درحقیقت عبادت اطاعت کا دوسرا نام ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ مطاع ہے اور اس کے بندے مطیع ہیں ۔ تو جس طرح مخلوق و خالق میں اطاعت کا رشتہ ہے اس طرح ایک اچھے معاشرے میں سبھی قابلِ اطاعت افراد کی اطاعت ہوگی تو ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا جو امن کا گہوارہ ہوگا ۔ ورنہ اطاعت سے خالی معاشرہ انتشار وافتراق کا شکار ہو جائے گا ۔

صالح معاشرہ کیلئے اطاعتی نظام لازمی امر ہے

یہ اصول کہ معاشرہ میں اہل حلّ وعقد کی اطاعت ضروری ہے ایک مسلّمہ امر ہے اگر ایک گھر میں والدین کی اطاعت نہ کی جاتی ہو تو اس گھر میں امن و اطمینان کا فقدان ہوگا یوں ہی تعلیمی درس گاہوں میں اساتذہ کا ادب واحترام ضروری ہے ۔ معاشرہ کی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ علماء کرام مشائخ عظام اور منصف حکّام کی اطاعت کی جائے آج کل جدید تعلیمی اداروں میں ہنگامے اور آئے دن ہڑتال کی بھرمار نے تعلیم کا ستیا ناس کر دیا ہے وجہ صاف ہے کہ اطاعتی نظام موجود نہیں بلکہ ہنگاموں کو آزادی کا نام دیدیا گیا ہے ۔ شاعر مشرق نے اس کی تصویر کشی یوں فرمائی ہے ۔

گو فکرِ خدا داد سے روشن ہے زمانہ
آزادیِ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

مخلوق خدا کی ہدایت کے لئے خدائی منتخب نمائندے حضرات انبیاء علیہم السلام نے

مخلوق میں اسی اطاعتی نظام کو قائم فرمایا چنانچہ بیوی خاوند کی مطیع ہو اور بچے ماں باپ کے مطیع ہوں تو ایک صالح معاشرہ وجود پاتا ہے۔ آج کل یورپ نے تو نقشہ بالکل ہی الٹ کر دیا ہے یورپین معاشرہ میں بیوی مطاع ہے اور خاوند مطیع یوں ہی اصاغر مطاع اور اکابر مطیع۔ اساتذہ مطیع شاگرد مطاع پھر معاشرے کی اصلاح کیسے ہو؟

اصلاح معاشرہ کے لئے چھٹا اصول ہے اَلتَّعَاوُنُ

الاصل السادس

بَیْنَ اَفْرَادِ الْمُعَاشَرَۃِ (معاشرہ کے افراد کا آپس میں تعاون)

انسانی زندگی کا نظام ایسا ہے کہ اگر افراد کا آپس میں تعاون نہ ہو تو اس میں زبردست مشکلات کا سامنا ہوتا ہے بلکہ انسانی زندگی کا نظام چل ہی نہیں سکتا۔

انسانی زندگی کا نظام باہم تعاون سے قائم ہے

دنیا کی زندگی میں اکیلا انسان کوئی کام انجام نہیں دے سکتا باہم تعاون کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے بڑے سے بڑا مالدار اور امیر آدمی بھی ایک غریب اور معمولی آدمی کا محتاج ہوتا ہے اس میں بڑی حکمت ہے کہ انسان کو صرف انسان کا نہیں بلکہ دیگر مخلوقات کا بھی محتاج بنا دیا گیا ہے ورنہ مالدار طبقہ فرعون بن جاتا اور دنیا ظلم سے بھر جاتی۔ باہم تعاون سے دماغ بھی ٹھیک رہتا ہے اور نظام عالم ٹھیک ٹھاک طور پہ چلتا ہے۔ سورۃ فاتحہ میں باہم تعاون کا ماخذ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ (اے اللہ ہم صرف آپ سے ہی مدد چاہتے ہیں) تمام انسانی افراد امداد کی درخواست کرتے ہیں اور خدا ان کا معین و مددگار ہے۔ انسانی نظام کو قائم رکھنے کے لئے قرآن پاک میں تو یہ بھی فرمایا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ۔ (اگر تم اللہ کے دین یعنی اصولوں کی امداد کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری امداد کرنے لگے) جبکہ یہ ایک خفیفت ہے

کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے دین کو ہماری احتیاج نہیں ہے لیکن انسانوں کو باہم تعاون کا سبق دینے کے لئے یہاں طرفین کے تعاون اور امداد کو بیان فرمایا ہے اگر مسلمان احکام اللہ کے دین کی مدد کریں گے تو ان کی بھی مدد ہوگی ورنہ صرف دعاؤں کا اثر نہیں ہوتا۔ قرآن پاک میں ایک جگہ تعاون کا ایک اصول بھی بتا دیا گیا ہے۔

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ (نیکی اور تقوی پر تعاون کرو اور گناہ و
وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۔ زیادتی پر تعاون نہ کرو)

معلوم ہوا کہ مطلق تعاون کا مطالبہ نہیں بلکہ نیکی پہ تعاون مطلوب ہے جو مقید اور مشروط ہے۔

الاصل السابع

اصلاح معاشرہ کے لیے ایک اہم اصول کا عنوان ہے اَلْهِدَايَةُ وَالتَّعْلِيْم ۔ (ہدایت اور تعلیم کا حصول) افراد معاشرہ کے لئے ہدایت و تعلیم ایک ضروری اور لابدی امر ہے اگر معاشرہ کی بنیاد علم و ہدایت پر ہوگی تو معاشرہ درست اور صحیح ہوگا ورنہ جہالت و گمراہی معاشرہ کو بگاڑ دے گی۔ علم و ہدایت کی وجہ سے افراد معاشرتی حقوق کو پہچان کر عمل کے لئے تیار ہوں گے اور کوئی بھی افرادِ معاشرہ کے حقوق پہ ہاتھ صاف نہیں کرے گا۔

جاہل اور بے ہدایت معاشرہ سے اللہ کی پناہ اس کا ماخذ سورۃ فاتحہ میں آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (اے اللہ ہم کو سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما) ظاہر ہے کہ صراطِ مستقیم ہدایت اور علم کی راہ ہے۔

الاصل الثامن

اصلاحِ معاشرہ کے لئے اصول نمبر ۸ کا عنوان ہے اَلْاِنْعَامُ لِمُصْلِحِ الْمُعَاشَرَةِ وَالتَّعْزِيْرُ لِمُفْسِدِ الْمُعَاشَرَةِ

(مصلح معاشرہ کو انعام اور مفسد معاشرہ کو سزا دی جائے) یہ عقل میں آنیوالی ایک واضح بات ہے کہ جو افراد قواعد و ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کے لئے کوشاں ہوں وہ یقیناً انعام کا استحقاق رکھتے ہیں ان کو انعام دیکر اصلاح معاشرہ کی کوششوں کی حوصلہ افزائی لازمی امر ہے اور جو فرد معاشرہ میں ایسے کام کرے جو اصلاح کے بجائے معاشرہ کو بگاڑ و فساد سے دوچار کردے تو مفسد اور قانون شکن کی حوصلہ شکنی لازمی چاہیئے یہ اصول سورۃ فاتحہ کی آخری آیت سے نکلتا ہے فرمایا

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ (ان لوگوں کے راستے کی درخواست ہے جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے جن پہ ناراضگی نہیں ہوئی اور نہ وہ گمراہ ہوئے)

مُصلح کو انعام مُفسِد کو سزا خدائی حکومت کا قانون ہے

اللہ تعالیٰ کی حکومتِ کبریٰ میں جب یہ قانون ہے کہ مصلح کے لئے انعام کا وعدہ ہے جبکہ مفسد کے لئے سزا کی وعید ہے تو اس دنیا کے اربابِ اقتدار جو صرف نام کے حکمران ہیں اپنی حکومت کو کامیاب بنانے کے لئے خدائی حکومت کا نمونہ سامنے رکھتے ہوئے مصلح معاشرہ کی دلجوئی کریں اور مفسد کو سزا دیں فساد کا دروازہ صرف اسی صورت میں بند ہو سکتا ہے۔ آج کل اشیاء خوردنی میں ملاوٹ عام ہے پیسے کے پجاری لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں وجہ سب کو معلوم ہے کہ ارباب حکومت خود قانون شکن ہوتے ہیں مجرمین کو منصف حاکم کا ڈر ہوتا ہے اپنے ساتھیوں سے یہ لوگ نہیں ڈرتے۔

فاروقی دور کا ایک واقعہ

تاریخ کامل میں ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ کے سامنے ملاوٹ کا کیس پیش ہوا ایک عورت نے دودھ میں پانی ڈالا تھا حضرت فاروق

اعظم نے عورت سے پوچھا تو اس نے جرم کا اقرار کیا آپ نے وجہ پوچھی تو عورت نے اس جرم کے ارتکاب کی وجہ اپنا فقر و فاقہ بتائی حضرت فاروقؓ نے اس کی امداد فرمائی اور فرمایا پھر ایسا نہ کرنا عورت نے وعدہ کیا کہ پھر دوبارہ ایسا نہ کروں گی۔ حضرت فاروق اعظم رضؓ کی وفات کے بعد اس عورت کی پڑوسن نے اس سے کہا کہ اب تو دودھ میں پانی ڈال لیا کر اس لئے کہ جس کی گرفت سے ڈر کر یہ کام چھوڑا تھا اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں عورت نے جواب دیا ہرگز ایسا نہ ہوگا جس شخصیت کی میں زندگی میں اطاعت کرتی تھی اب اطاعت نہ کرنا غداری ہے جس کا ارتکاب نہیں کروں گی پھر مالک و خالق زندہ ہے جو دیکھ رہا ہے لیکن اب تو صورتِ حال بدل گئی ہے مثلاً ایک مجرم نے ایک لاکھ روپے کا غبن کیا یا رشوت لی تو صرف دو سال کے لئے اس کو جیل بھیج دیا جاتا ہے حالانکہ جیل کوئی سزا نہیں ہاں تا تصفیہ اگر مجرم کے بھاگنے کا خطرہ ہو تو مجرم کو حبس میں رکھا جا سکتا ہے۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ ایک لاکھ رشوت لینے والا تو دو سال میں اس قدر کمائی نہیں کر سکتا تھا وہ تو جیل میں چار سال بھی رہنے کے لئے تیار ہوگا اور لاکھ روپے کو انعام سمجھتا ہے۔ مجرم کو صرف جیل کی سزا ایک غیر فطری سزا ہے اسی لئے تو آج کل جرائم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یوں ہی اگر کسی بدبخت نے قتلِ ناحق کا ارتکاب کیا ہے تو اس کو زیادہ سے زیادہ چودہ سال کی سزا ہوتی ہے اور بس۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس سزا میں مقتول کے ورثاء کو کیا ملا؟ جالان طرفین کا ہو جاتا ہے اور پھر مقدمہ بازی میں بقیہ گھر کا اندوختہ ختم ہو جاتا ہے اور قاتل صاحب اس قید کے عرصہ میں سرکار کا کام کرتا ہے۔ اس سزا کا مطلب تو یہ ہوا کہ گویا حکومت کی طرف سے مجرم کو یہ سبق ملتا ہے۔ کہ قتل کرو پھر تمہاری سزا یہ ہے کہ چودہ برس حکومت کی خدمت کرنا نقصان مقتول کے ورثا کو ہوا اور فائدہ حکومت کو پہنچا یہ عقل ہے اور انصاف ہے؟ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

اسلام نے تو قتل کی سزا قصاص یا دیت کو مقرر کیا ہے اگر قاتل مقتول کے وارثوں کی چاہت کے مطابق قتل کر دیا جائے تو جذبہ انتقام کو تسکین ہوگی اور اگر دیت کا فیصلہ ہو جائے تو یہ دیت چونکہ وارثوں کو ملے گی اس لئے مالی فائدہ ان کو ہوا پھر بھی جذبہ انتقام ختم ہو جائے گا۔ ہم نے (حضرت افغانی) متحدہ رہا تھا تب فلاٹ میں دیت کا قانون جاری کیا جو حدیث کے مطابق سَو اونٹ ہوتے ہیں آج کل ان کی قیمت لگا کر دیت دی جا سکتی ہے اس قانون کے اجراء سے وہاں قتل کی وارداتوں میں نمایاں کمی ہوئی اصل بات یہ ہے کہ حکیم مطلق جو خدا ہے اس کے قوانین اور احمق انسان کے قوانین میں بھی فرق ہوتا ہے۔ سزا تو ایسی ہو جس سے جرائم میں کمی ہو جس طرح مؤثر دوا مرض کو ختم کر دیتی ہے ایسے ہی جرائم کو مٹانے والے قوانین صرف خالق کائنات کے ہو سکتے ہیں خالق انسان انسانی فطرت اور اس کے تقاضوں کو بھی جانتا ہے اس لئے جرائم کی سزا انسانی فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق رکھی گئی ہے۔

غیر اسلامی سزائیں انسانی فطرت کے مطابق نہیں

آج کل جرائم میں اضافہ کا سبب غیر اسلامی سزائیں ہیں یہ غیر اسلامی سزائیں چونکہ انسانی جذبے کی تسکین نہیں کرتیں اس لئے معاشرہ میں اصلاح کے بجائے بگاڑ کی زیادتی ہے مثلاً قتلِ عمد میں وارثوں کی مرضی سے اور قتلِ خطاء میں بہر صورت دیت کا اسلامی قانون انسان کے انتقامی جذبے کو ٹھنڈا کر دیتا ہے وجہ یہ ہے کہ مشہور قاعدہ ہے کہ الانسان عبید الاحسان (انسان احسان کا غلام ہے) حکومت کے واسطے سے مالی جرمانہ وصول ہونے کے بعد مقتول کے ورثاء کا انتقامی جذبہ یقیناً سرد ہو جائے گا۔ اس سے معاشرہ میں امن و سکون پیدا ہوتا ہے۔ الغرض اصلاحِ معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ مصلح کو انعام اور مفسد کو سزا دی جائے اس کے بغیر امن و سکون کا،

معاشرہ قائم کرنے کی فکر ایک خام خیالی ہے۔ جب خدائی حکومت جو حکومت کبریٰ ہے مصلح کو انعام اور مفسد کو سزا دیتی ہے تو ان مجازی حکمرانوں کو خدائی طریقہ پر چلکر بگاڑ کا سدِ باب کرنا اپنی حکومت کو استحکام بخشنا ہے۔

⑤ سُورۂ فاتحہ کی عرفانی تفسیر

تصوّف کی کلی روح سیر الی اللہ (اللہ کی طرف چلنا) ہے اس کو سلوک بھی کہتے ہیں اس کے بعد وصول الی اللہ (اللہ تک پہنچنا) کا درجہ ہے اور پھر اس کے بعد بقار کے وصول کا درجہ ہے کہ یہ دولت چھن نہ جائے بلکہ وصال ہمیشہ باقی رہے اور وصال کی بجائے فراق نہ ہونے پائے۔ اسی کو قرآنی الفاظ میں استقامت بھی فرمایا گیا ہے۔

سیرِ روحانی و جسمانی

سیر الی اللہ سیر روحانی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا والے کام کرنا اور ایک سیر جسمانی ہوتی ہے یہ دونوں مختلف اور آپس میں متباین ہیں۔ سیر جسمانی کی مثال یہ ہے کہ ایک آدمی مثلاً بہاولپور سے لاہور جاتے تو یہاں جانین سے محدودیت ہے یا یوں کہو کہ سالک بھی محدود اور مسلوک الیہ (منزل) بھی محدود چونکہ سیر کو سلوک بھی کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ چلنے والا یعنی متحرک اور جائے حرکت اور پھر منزل مقصود یہ سب ہی محدود ہیں اور متعین ہیں یہ جسمانی سیر ہوئی۔ سیر روحانی اور جسمانی دونوں کی الگ الگ ضروریات ہیں۔

سیر جسمانی کی ضروریات

سیر جسمانی میں چند اہم ضرورتیں ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

① حركة المتحرك حركة جسمانية سواء كان بالذات او بالواسطة۔

چلنے والے کی جسمانی حرکت خواہ بالذات ہو یا بالواسطہ مثلاً اگر آدمی پیدل چلتا ہے تو یہ حرکت بالذات ہے اور اگر ریل، موٹر

ہوائی جہاز، وغیرہ کے ذریعہ جائے تو یہ حرکت بالواسطہ کہلائے گی۔ خلاصہ یہ کہ جسمانی سیر میں بالذات یا بالواسطہ حرکت ضروری ہے۔

انتخاب الطّریق الموصل

منزل تک پہنچانے والے راستے کا انتخاب جسمانی سیر میں دوسری اہم چیز صحیح راستے کا انتخاب ہے یعنی جس راستے پر آدمی چل رہا ہے وہ راستہ واقعتاً منزلِ مقصود تک پہنچانے والا ہو مثلاً مثالِ مذکور میں وہ راستہ اور روڈ لاہور جا رہا ہو یہ نہ ہو کر کراچی کی سڑک پر چل پڑے تو لاہور نہیں پہنچے گا الغرض صحیح راستے کا انتخاب بھی ضروری ہے۔

(۳) قطع المسافت

حائل مسافت کا قطع کرنا ضروری ہے۔ یعنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے جائے حرکت سے منزلِ مقصود تک جو فاصلہ ہے وہ عبور کرنا ضروری ہے۔

(۴) عدم الانحراف فی اثناء الطریق

درمیان میں راستہ بدلا نہ جائے یعنی منزلِ مقصود تک وصول کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اثنائے طریق میں منزل سے انحراف نہ ہو جائے ورنہ منزل نہیں ملے گی۔ یہ چار ضرورتیں سیر جسمانی کی ہیں۔

سیر روحانی کی تفصیلات

سیر روحانی میں متحرک سالک کی روح ہے اور باری تعالیٰ جل مجدہٗ کی ذات منزلِ مقصود ہے۔ یہاں روحانی سیر میں انتخاب الطریق الموصل (منزل تک پہنچانے والے راستے کا انتخاب) اتباع شریعت ہے یہی وہ سڑک ہے جس پر چل کر ایک سالک ذات باری سبحانہٗ وتعالیٰ سے واصل ہوتا ہے اگر کوئی سالک اتباع شریعت والی سڑک کے انتخاب کے بجائے بدعت کا راستہ اپنے لئے منتخب کر

لیتا ہے تو اس کا وصال ذاتِ باری سے قطعاً نہیں ہوگا۔ باقی سیر جسمانی میں جس طرح منزل تک پہنچنے کے لیے قطع مسافت لازمی امر ہوتا ہے یہاں سیر روحانی میں چونکہ متحرک روح ہے جس کو جسمانی حرکت کی ضرورت نہیں پھر روحانی سیر کی منزل چونکہ ذات خداوندی ہے جو کسی خاص مکان میں نہیں اس لیے اس فن کے ماہرین حضرات عارفین کے بیان کے مطابق سیر روحانی میں قطع مسافت سے مراد قطعِ الحُجُب (پردوں کا قطع کرنا) ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پردے جو اللہ تعالیٰ اور سالک میں حائل ہیں ان کو ہٹا کر اور قطع کر کے ہی ایک سالک کو وصول الی اللہ ہو سکتا ہے اس کے بغیر خدا تک پہنچنا ممکن نہیں ظاہر ہے کہ بندوں اور خالق میں بہت پردے ہیں۔

سیر روحانی میں حجابات

سیر الی اللہ میں حائل حجابات کی تفہیم کے لیے ایک مثال

(پردوں) کے قطع کرنے اور ہٹانے کو ایک محسوس مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ فرض کرو مطلع صاف ہو اور سورج خوب چمک رہا ہے ایک شخص ہے جو خیمے کے اندر بیٹھا ہوا ہے اور خیمے کے چار پردے یکے بعد دیگرے اوپر نیچے تنے ہوئے ہوں اور وہ شخص چار پردوں یا دوسرے الفاظ میں چار خیموں کے اندر ہے اب سوال یہ ہے کہ ان خیموں اور پردوں کے اندر بیٹھنے والا شخص اگر چاہے کہ سورج کی روشنی وہیں بیٹھے بیٹھے اس تک پہنچ جائے تو اس کی صورت کیا ہوگی؟ اس کی صورت یہی ممکن ہے کہ وہ چاروں پردے یا خیمے اٹھا دیئے جائیں پردے ہٹتے ہی سورج کی روشنی اس بیٹھے ہوئے شخص تک پہنچ جائے گی لیکن پردے ہٹائے بغیر بیٹھے ہوئے شخص تک سورج کی روشنی پہنچنی ناممکن ہے اس مثال سے یہ حقیقت واضح کرنی مقصود ہے کہ تصوف کی بول چال میں وصول الی اللہ کے لئے حجابات کا ہٹانا ضروری ہے سیر جسمانی میں، متحرک بھی محدود اور منزل بھی محدود اور ایک متعین مقام ہوتا ہے لیکن سیر روحانی میں

منزل ذاتِ خداوندی غیر محدود ہے اور سیر متحرک اور منزل مقصود میں کوئی ظاہری فاصلہ بھی نہیں ہوتا جس کو قطع کیا جائے بلکہ سیر روحانی ہیں تو مقصود اللہ کی ذات الیٰ ہے جس کے متعلق قرآن پاک میں ارشاد ہے وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (تم جہاں کہیں ہو وہ تمہارے پاس ہے) مثالِ مذکور میں جیسے ضوءِ شمس تک پہنچنے کے لئے بغیر اس کے کہ خود ایک انچ ہٹیں حوائل اربعہ کو ہٹانا ضروری ہے اسی طرح باری تعالیٰ اور بندے کے درمیان جو حجابات ہیں وہ قطع مسافت کے قائم مقام ہیں ان کے ہٹانے سے وصول الی تجلی الٰہیہ (اللہ کی تجلی تک پہنچنا) ہوگا۔

حجاباتِ اربعہ کی حقیقت

پردے ظاہری نہیں بلکہ یہ روحانی چار پردے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کہیں چار پردوں کا ذکر کرتے ہیں اور کہیں تین کا ذکر کرتے ہیں لیکن تفہیمات الٰہیہ میں چار حجاب ذکر فرماتے ہیں اور یہی درست ہے روحانی چار پردے یہ ہیں، حجاب الغفلۃ (غفلت کا پردہ) حَجَابُ الجہل (جہالت کا پردہ) حِجَابُ الرَّسم (رسم کا پردہ) حجابُ الخوف والرجاء من غَیرِ اللہِ۔ (غیر اللہ سے خوف و امید کا پردہ) اب ان حجابات کی تشریح اور تفصیل بیان کی جاتی ہے جو درج ذیل ہے

حجابُ الغفلۃ

غفلت کا ذکر قرآنِ پاک میں بھی ہے:

"اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ"

(یہ سب لوگ غافل ہیں) غفلت کی تعریف یہ ہے:

اِنحراف عن الاہم الی الاجل (اہم ترین چیز سے انحراف غیر اہم میں

الاشتغال لغیر المھم مشغول ہو کر مثلاً ایک آدمی دنیا کے کاموں میں مشغول و مصروف ہو کر آخرت کی تیاری سے غفلت و انحراف کرے جبکہ آخرت امر مُہم ہے دنیا کے مقابلے میں یوں ہی اللہ تعالیٰ کی ذات مُہم ہے اور ماسوی اللہ کل عالم غیر مہم ہے عبد اور معبود کے درمیان یہی حجاب غفلت ہے اس غفلت کے پردے کو جبتک چاک نہ کر دیا جائے اس وقت تک وصالِ خداوندی ایک سالک کے لئے ممکن نہیں اسی لئے عارفین حضرات اس غفلت کو رفع کرنے کے لئے مسترشدین کو ذکر اللہ کی تعلیم دیتے ہیں۔

۲۔ حجاب الجہل

ایک پردہ جہالت کا بھی ہوتا ہے۔ انسان چونکہ کمالاتِ خداوندی سے جاہل اور ناواقف ہوتا ہے اس لئے یہ بھی اس کے لئے حجاب کا سبب بن جاتا ہے مثلاً ایک آدمی کو چلتے ہوئے سڑک پر کوئی چیز نظر آئے لیکن چلنے والے کو جب اس کی خوبیوں کا علم نہیں ہوتا اگرچہ وہ چیز انتہائی قیمتی ہی کیوں نہ ہو وہ ناواقفی کی وجہ سے غافلانہ انداز میں گذر جاتا ہے اور اس کام کی چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوتا یہی حال اس بندے کا ہوتا ہے جو کمالات خداوندی سے جہالت اور ناواقفی کی بنا پر اللہ، ربّ العلمین کی طرف متوجہ نہیں ہوتا عرفا کی اصطلاح میں اسی صورتِ حال کا نام حجاب جہل ہے اس راستے کے ماہرین اور اساتذہ کے لئے علمائے سلف کے کلام میں عارف باللہ کی اصطلاح اسی لئے مستعمل ہے کہ یہ حضرات کمالات خداوندی کے پہچاننے والے ہوتے ہیں الغرض جہالت بھی عبد و معبود کے درمیان ایک حجاب ہے۔ تو کمالاتِ حق تعالیٰ سے واقف نہ ہونا حجاب الجہل ہے۔

۳۔ حجاب الرسم

یعنی رسم و رواج کا پردہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں ماحول اور سوسائٹی

کے کچھ محبوبات و مألوفات ہوتے ہیں مثلاً شادی کی رسمیں. غمی کی رسمیں. سیر و تفریح کی چاہتیں اور مختلف طریقے جاری ہوتے ہیں ایک آدمی ان رسمیات میں پڑ کر اصل دین سے غافل ہو جاتا ہے اس لیے اس کا خیال نہیں ہوتا کہ شریعت کی نظر میں ان رسموں کی حیثیت کیا ہے؟ مخالف ہیں یا موافق؟ حقیقت یہ ہے کہ رسم اور شریعت دو متضاد چیزیں ہیں اس لیے کہ شریعت تو ضوابط الٰہیہ للحیٰوۃ کا نام ہے (یعنی زندگی گذارنے کے طریقے اور ضابطے شریعت میں جو بتائے گئے ہیں) جبکہ ضوابط مروجہ للحیٰوۃ کا نام رسم ہے جن میں یہ بحث نہیں کی جاتی کہ یہ شریعت کے موافق ہیں یا مخالف ——— یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جس طرح ایک قدم بیک وقت دو جوتوں میں نہیں پڑ سکتا ایک تلوار بیک وقت دو نیاموں میں نہیں آ سکتی اسی طرح زندگی بھی بیک وقت قالب شریعت اور قالب رسم میں نہیں سما سکتی. زندگی جب قالب رسم میں ہوگی تو مَحْجُوْب عَنِ الشَّرِیْعَۃ ہوگی اور جب قالب شریعت میں ہوگی تو محجوب عن الرسم ہوگی. الحاصل حجابات میں ایک اہم حجاب رسم و رواج کا بھی ہے۔

حجاب خوف و رجاء من غیر اللہ

یعنی خوف و اُمید غیر اللہ سے ہو

ایک پردہ یہ بھی ہے. اصل بات یہ ہے کہ توجہ الی اللہ کے دو محرک ہیں ایک محرک خوف ہے جبکہ دوسرا محرک رجاء (اُمید) ہے. خدا کی طرف توجہ اور دھیان کے لیے یہ دونوں محرک یوں ہیں کہ ایک بندہ جب مضبوط یقین رکھتا ہے کہ نفع اور نقصان کا مالک صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اس کی مرضی کے بغیر کل کائنات مل کر بھی کچھ نہیں کر سکتی یقینی بات ہے کہ جب خوف و رجاء کا مرکز صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہو گی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ توجہ الی اللہ ہو گی اور اللہ کی طرف توجہ کا مطلب اور

معنی طاعات اور بھلائیوں کو بجالانا اور گناہ و معصیت کو چھوڑ دینا ہوتا ہے۔ امتثالِ طاعات سے چونکہ نفع کی امید ہوتی ہے جبکہ ترکِ معصیت سے ضرر اور نقصان سے بچاؤ ہوگا الغرض مرکز خوف و رجا رب صرف خدا ہوگا تو عبد اور معبود میں حجاب جو وصال کے لیئے رکاوٹ ہے ختم ہو جائے گا۔

یہاں تک حجاباتِ اربعہ کا بیان ہوا جو وصول الی اللہ میں رکاوٹ ہیں اور تقریب فہم کے لیئے مثالوں سے وضاحت بھی امکان کی حد تک کر دی گئی ہے پھر سلوک کے متعلق تینؔ کلیات کا بیان بھی ہو گیا ہے کہ ایک سیر الی اللہ ہے دوم وصول الی اللہ اور پھر سوم لقائے وصول الی اللہ ہے

سُورۂ فاتحہ سے سلوک کے کلیّات کا استخراج

سورۂ فاتحہ کی عرفانی

تفسیر کے تحت اب مندرجہ بالا کلیات کا استخراج اور مآخذ کا بیان ہو گا تو سیر الی اللہ میں قطع مسافت کی ضرورت ہے اور یہ بیان ہو چکا ہے کہ روحانی سیر میں قطع مسافت کے بجائے حجابات (پردوں) کو اٹھانا ہے اور حجابات چار ہیں جن میں پہلا حجاب، حجاب غفلت ہے اس کو قطع کے لیئے سورۂ فاتحہ کا پہلا جملہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ (سب تعریفیں اللہ کے لیئے ہیں) لایا گیا ہے۔ گویا یہاں بندہ حامد ہے اور اللہ محمود ہے اس کی حمد و ثنا اس کا ذکر ہے اور ذکر اللہ سے غفلت کا حجاب چاک ہو جاتا ہے اگر کبھی کبھار غیر ضروری اور غیر اہم چیز کی طرف دھیان گیا تو اس کا علاج بار بار ذکر اللہ سے ہوگا اور ذکر کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے توجہ الی المذکور ہوتی ہے مذکور اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس قدر ذکر ہوگا اسی قدر توجہ الی اللہ زیادہ ہوگی۔ جس سے غفلت کا پردہ دور ہوگا الغرض اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا جملہ تفسیر عرفانی میں ازالہ غفلت کے لیئے ہے۔

دوسرا حجاب جس کو سیر الی اللہ میں قطع کرنا ہوتا ہے وہ حجاب جہل ہے
اس کو دور کرنے کے لیئے اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بجائے فکر کا طریقہ بتایا گیا ہے
کہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف اور کمالات میں فکر کرو اس سے حجاب جہل دور ہوگا وہ
کمالات خداوندی جو یہاں بیان کیئے گئے ہیں چار ہیں جو یہ ہیں (۱) ربوبیت عامہ۔ اس
کو رب العلمین (جہانوں کی تربیت کرنے والا) میں بیان فرمایا ہے۔
(۲)۔ رحمت عامہ۔ اس کو الرحمٰن (مہربان) میں (۳) رحمت خاصہ۔ اس کو الرحیم۔
(نہایت رحم کرنے والا) میں بیان فرمایا گیا ہے۔ (۴) عدالت الٰہیہ۔ اس کو ملک
یوم الدین (انصاف کے دن کا مالک ہے) میں بیان فرمایا گیا ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ ان کمالاتِ باری میں تفکر سے جہل بالباری کا ازالہ ہوگا اور باری تعالیٰ
کی معرفت حاصل ہوگی جس سے حجاب جہل کا خاتمہ ہو جائے گا۔
پھر حجاب الرسم کو دور کرنے کے لیئے جملہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ۔
(ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں) میں تدبیر بیان کی گئی ہے کہ جب بندہ کہتا
ہے کہ اے اللہ صرف تیری ہی اطاعت کرتے ہیں نہ کہ رسم ورواج کی، اللہ تعالیٰ
کی اطاعت کا مطلب شریعت پر چلنا ہے جب معبود وہ ہی ایک ہے تو شارع بھی
وہ ہی ہے شریعت تو انسانوں کے لیئے لائحہ عمل ہے اس تصور و عقیدے سے
تمام رسمی حجابات ختم ہو جائیں گے۔ صوفیائے کرام کی اصطلاح میں اسی کا نام مراقبہ
تشریعیہ ہے اس مراقبہ سے حجاب الرسم رفع ہو جاتا ہے۔ ایّاک نعبد
میں تفسیر عرفانی کے تحت مراقبہ تشریعیہ کا استنباط بالکل قرین قیاس ہے۔
چوتھا حجاب خوف ورجاء مِنۡ غَیۡرِ اللہِ۔ کے ازالہ کے لئے صوفیائے
کرام کے ہاں مراقبہ تکوینیہ ہوتا ہے کہ پوری کائنات کے متعلق غور کرو کہ وہ کس کے
قبضہ قدرت میں ہے، سورہ فاتحہ کا جملہ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (ہم

تجھ سے ہی امداد کے طلب گار ہیں) مراقبۂ تکوینیہ کا ماخذ ہے کہ اے اللہ تمام مشکلات ومصائب میں صرف تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں کیونکہ کائنات کا واحد مدبّر صرف تیری ذات ہے الغرض جب تصرّف عام صرف اللہ رب العلمین میں منحصر ہے تو پھر کسی اور سے نہ ڈر ہوگا اور نہ امید و توقع رکھیں گے۔

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْن۔ تک کلیاتِ ثلثہ میں پہلی چیز یعنی سیر الی اللہ کا بیان ہوا ہے اب وصول الی اللہ سورۂ فاتحہ کی آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (اے اللہ صراط مستقیم کی ہدایت عطا فرما) میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی جب تمام حجابات کٹ گئے رفع ہوگئے تو اس کو پانا باقی ہے یہاں ہدایت کا معنی ایصال الی المطلوب لینا زیادہ مناسب ہوگا تو دعا کے انداز میں وصول الی اللہ کو بتایا گیا ہے۔

اب تیسری چیز بقائے وصول ہے اس کا بیان آگے ہے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْن (ان کا راستہ عطا فرما جن پہ تیرا انعام ہوا ہے جن پہ ناراضگی نہیں ہوئی اور نہ وہ گمراہ ہوئے) وصول الی اللہ کے بقا کے لئے یہاں دو تدبیریں بتائی گئیں ہیں ایک صحبتِ مقبولین اور دوم ہے ترک صحبتِ مردودین۔ انعام یافتہ طبقہ نبییّن صدّیقین شہدا صالحین کا ساتھ نصیب ہوجائے اور مغضوبین ضالّین سے بچاؤ ہوجائے تو پھر وصول الی اللہ کی دولت ہمیشہ باقی رہے گی۔ بلکہ مسلمان فاسق کی صحبت بھی سالک کے لئے خطرناک ہونے کی وجہ سے قابل ترک ہے۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند ✤ صحبتِ طالح ترا طالح کند

اے اللہ صالحین کی صحبت نصیب فرما۔ آمین ثم آمین

تفسیر عرفانی کا بیان ختم ہوا۔

⑥ سُورۂ فاتحہ کی سیاسی تفسیر

سُورۂ فاتحہ کی سیاسی تفسیر کے ضمن میں یہ بیان ہوگا کہ سُورۂ فاتحہ نے ہمیں سیاست کے متعلق کون سے اُصول دیئے ہیں؟

سیاست کی تعریف

سیاست کی تعریف یُوں کی گئی ہے:

هو النّظام المحافظ للحقوق الالٰهيّة والبشريّة۔	سیاست ایسے نظام کا نام ہے جو حُقوقِ الٰہیہ اور انسانی حقوق کا محافظ ہو۔

لفظ سیاست حکومتی نظم ونسق کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد منقول ہے:

كانت بنو اسرائيل تسوسهم الأنبياء كلّما هلك نبيّ خلفه نبيّ وانّه لا نبيّ بعدى وسيكون خلفاء فيكثرون۔ (بخاری ج ۱ کتاب الانبیاء ص ۴۹۱)	بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء علیہم السلام چلایا کرتے تھے جب کوئی نبی دنیا سے رُخصت ہو جاتا تو اُس کے قائم مقام دوسرا نبی آ جاتا اور سُنو میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ ہاں میرے خُلفاء ہونگے اور بہت ہونگے۔

اس حدیث شریف سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ سیاست کوئی دورِ جدید کی اختراع نہیں بلکہ یہ وہ حقیقت ہے کہ جس کا ذکر چودہ سو سال قبل پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات میں بھی ملتا ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں دو قسم کی سیاست کا پتہ چلتا ہے:۔

ایک سیاستِ الٰہیہ اور

دوسری سیاستِ انسانی

سیاستِ الٰہیہ اور انسانی سیاست

اس اسلامی عقیدے کا تو سب کو علم ہے کہ جس طرح پوری کائنات کو پیدا کرنے والی ذات اللہ رب العالمین کی ہے۔ اسی طرح کائنات کی حاکم اعلیٰ بھی وہی ذات ہے اور تمام مخلوق بلا استثنا اللہ تعالیٰ کی رعیت اور محکوم ہے۔ یہ سیاست الٰہیہ کا نظام ہے۔ سیاست کا دوسرا نظام انسانی سیاست ہے۔ انسانی سیاست اس وقت کامیاب ہوگی جبکہ یہ سیاست الٰہیہ کی طرز پر ہو، اسلام نے اسی سیاست کو خلافت سے تعبیر کیا ہے۔ جس کا آغاز ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا ہے قرآن پاک میں " اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ..... الآیۃ۔ میں اسی خلافت کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ تمام رسل وانبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے خلفاء تھے حضرت آدم علیہ السلام پہلے خلیفہ تھے جبکہ ہمارے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے آخری خلیفہ ہیں جس طرح آپ پر نبوت ختم ہوئی اسی طرح آپ پر ہی خلافت الٰہیہ بھی ختم ہوگئی اور آپ کے بعد خلفاءِ راشدین اور بعد کے دور کے ملوک اسلام اور پھر قیامت تک آنے والے مسلمان حکمران درجہ بدرجہ حضور اکرم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفاء ہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ ارشادِ نبوی کے مطابق خلافتِ راشدہ تو آپ کے بعد تیس سال تک ہی ہے۔ لیکن دُوسرے حُکام اسلام بھی اپنے اپنے درجہ کے مطابق خلفاءِ نبوت میں شامل ہیں۔ یہاں تک کہ آخری دَور میں حضرت امام مہدی اس اُمّت میں خلیفہ ہوں گے۔

خُلفاءِ نبوّت کی سیاست

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نبوّت کی خلافت کا دَور چلا۔ چنانچہ قرآنِ پاک میں اس کا ذکر یوں فرمایا گیا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ وَلَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

(النّور : ۵۵)

(اے اُمتِ محمدیہ) تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اُن سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ انکو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا کہ ان سے پہلے (اہلِ ہدایت) لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند کیا ہے (یعنی اسلام) ان کو اس کے لئے قوت دے گا اور ان کے خوف کے بعد اس کو مبدّل بہ امن کر دے گا۔ بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں اور جو شخص اسکے بعد ناشکری کرے گا تو ایسے لوگ نافرمان ہیں۔

٭ ٭ ٭

آیت میں اُمت کے مومنین صالحین سے اللہ تعالیٰ نے خلافت نبوت دینے کا وعدہ فرمایا ہے کہ وہ پیغمبر کے جانشین ہو کر زمین پر حکمرانی کریں گے صرف اقتدار دینے کا وعدہ نہیں بلکہ خلافت نبوت کا وعدہ ہے چنانچہ آیت لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ مضارع کے صیغہ کے شروع میں لام تاکید اور آخر میں نون تاکید ثقیلہ کا اضافہ کر کے حتمی اور مضبوط وعدہ فرمایا ہے کہ ان کو ضرور بالضرور استخلاف فی الارض عطا فرمائیں گے۔ پھر آگے آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب زمین میں خلافت نبوت قائم ہوتی ہے تو اس کے ثمرات بھی ساتھ آتے ہیں جو یہ ہیں:

نمبر ۱: استحکام دینِ خداوندی یعنی ان کو حکومت اور اقتدار دینے سے مقصود یہ ہوگا کہ دین اسلام مضبوط اور مستحکم ہو جائے کہ دنیا کی کوئی طاقت اسکو ہلا نہ سکے۔ آیت میں " وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ " میں اسی کو بیان فرمایا گیا ہے۔ اور یہ دین تمام ادیان پر غالب ہوگا۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ .... الآیۃ

نمبر ۲: تحفظ حقوقِ بشریہ: یعنی مسلمانوں کے دلوں سے کافروں کا خوف نکل جائے گا۔ حقوقِ انسانیہ کے تلف ہونے کا خوف امن سے بدل جائیگا۔ وہ حق چاہے مال کا ہو یا جان کا ہو یا عزت و آبرو کا ہو، یعنی وہ امن و سکون سے زندگی گذاریں گے۔ آیت میں نہایت تاکید سے اس کا ذکر یوں فرمایا:

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا۔ اور اللہ تعالیٰ ضرور ان کے خوف کو امن سے بدل دیگا۔

صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعے فتح ہوا اور مزید برآں ہجر کے مجوسیوں سے اور ملکِ شام

کے بعض اطراف سے آپ نے جزیہ وصول فرمایا، اور شاہِ روم ہرقل نے اور

شاہِ مصر و اسکندریہ مقوقس اور شاہانِ عمان اور بادشاہِ حبشہ نجاشی وغیرہ نے آنحضرت

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ھدایا بھیجے اور آپ کی تعظیم وتکریم کی۔ پھر آپ کی وفات کے بعد

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ ہوئے تو وفات کے بعد جو فتنے پیدا ہو گئے

تھے ان کو ختم کیا اور بلادِ فارس اور بلادِ شام و مصر کی طرف اسلامی لشکر بھیجے اور

بُصرای اور دمشق آپ ہی کے زمانہ میں فتح ہوئے اور کچھ دوسرے ملکوں کے بھی

بعض حصّے فتح ہوئے۔

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے

ان کے دل میں اپنے بعد عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ بنانے کا الہام فرمایا۔

حضرۃ عمر بن الخطاب، خلیفہ ہوئے تو نظام خلافت ایسا سنبھالا کہ آسمان نے انبیاء علیہم السلام

کے بعد ایسا نظام کہیں نہ دیکھا تھا۔ ان کے زمانہ میں ملکِ شام پورا فتح ہو گیا۔ اسی طرح پورا

ملکِ مصر اور ملکِ فارس کا اکثر حصّہ بھی فتح ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے زمانہ

خلافت میں قیصر و کسرٰی کے اقتدار کا خاتمہ ہوا۔

اسکے بعد خلافت عثمانیہ کا دور آیا تو اسلامی فتوحات کا دائرہ زمین

کے مشرق و مغرب تک وسیع ہو گیا اور بلادِ مغرب اندلس و قبرص تک، مشرق تھی

میں بلادِ چین تک، اور عراق، خراسان، اھواز، آرمینیا اور آذربائی جان وغیرہ حضرۃ

عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں فتح ہوئے۔

اور یوں صحیح حدیث میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ

نمبر۲ : تحفظِ حقوقِ الٰہیّہ : اسکو آیت میں یوں بیان فرمایا :

یعبدوننی ولا یشرکون بی شیئًا : وہ مسلمان میری بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔

اس میں تمام حقوقِ الٰہیہ آجاتے ہیں پہلے جملہ میں ثبوتًا اور دوسرے میں سلبًا حقوقِ الٰہیہ بیان کئے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح انسانی سیاست وہ ہوتی ہے جو سیاستِ الٰہیہ کے طرز پر ہو اور جس میں حقوقِ الٰہیہ اور حقوقِ بشریہ کا پورا پورا تحفظ ہو۔

آیت استخلاف اور خلفائے راشدین

آیت استخلاف کے ذیل میں مشہور مفسر حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت جامع تبصرہ فرمایا ہے جس کا خلاصہ نہایت جامع اور سلیس انداز میں مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مرحوم نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں لکھا ہے اس موقع پر اس کا نقل کرنا فائدہ سے یقینًا خالی نہ ہوگا۔ وھو ھذا ..... (مرتب)

"اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین چیزوں کا وعدہ فرمایا :

نمبر۱ : آپ کی امت کو زمین پر خلفاء و حکمران بنایا جائے گا۔

نمبر۲ : اور اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دینِ اسلام کو غالب کیا جائے گا۔

نمبر۳ : مسلمانوں کو اتنی قوت و شوکت دی جائے گی کہ ان کو دشمنوں کا کوئی خوف نہ رہے گا۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ پورا فرمایا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہدِ مبارک میں مکہ، خیبر، بحرین اور پورا جزیرۃ العرب اور پھر پورا ملک یمن آنحضرت

مجھے زمین کے مشارق و مغارب سمیٹ کر دکھائے گئے ہیں اور میری امت کی حکومت ، ان تمام علاقوں تک پہنچے گی جو مجھے دکھائے گئے ہیں ۔ واقعۃً اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ خلافتِ عثمانیہ میں ہی پورا فرما دیا ۔ (انتہیٰ)

ملوکیت اور اسلام | خلفائے راشدین کے بعد بھی کچھ بادشاہانِ اسلام ان کے نمونہ کے آتے رہے اور جب تک اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی عادل و منصف حکمران آتے رہیں گے ، ہاں خلافتِ راشدہ تو خلفائے اربعہ پر ختم ہوگئی ۔ خلافتِ نبوت کی پوری جھلک تو خلافتِ راشدہ ہی میں تھی لیکن عدل و انصاف سے جب بھی کسی نے حکمرانی کی اسکی توصیف کی گئی اسکی واضح مثال تابعین کے دور میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی حکومت ہے جسکو خلافتِ راشدہ کا تتمہ کہا گیا ہے پھر بنو امیہ اور بنو عباس اور بعد کے حکمران خلفاء ہی کہلاتے رہے ہیں فقہاء اور محدثین نے ان کی غلط باتوں اور ناانصافیوں پر نکیر اور تنقید کے باوجود انہیں خلفائے اسلام ہی قرار دیا ۔ حکمرانی کا اصل مقصود عدل و انصاف کا نفاذ اور نظامِ اسلام ہے ۔ طرزِ حکومت کوئی بھی ہو اگر اقتدارِ اعلیٰ رب العالمین کا تسلیم کرتے ہوئے مخلوق میں عدل قائم کیا جائے اور حکومت کا مذہب بھی من حیث الحکومت اسلام ہو تو ایسی حکومت اسلامی حکومت ہی ہوگی ۔

ملوکیت کا فساد | جس حکومت میں حقوق الہیہ اور حقوقِ بشریہ کا تحفظ نہ ہو وہاں حق تلفی کی وجہ سے فساد یقیناً ہوگا ۔ قرآن پاک میں ملکۂ بلقیس کی زبانی اس کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے :

قالت إن الملوك إذا دخلوا قرية أفسدوها وجعلوا أعزة أهلها أذلة وكذلك يفعلون ۔

(سورۃ النمل آیۃ ۳۴)

بلقیس کہنے لگی کہ بادشاہ جب فاتحانہ طور پر کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسکو تہ و بالا کر دیتے ہیں اور بستی کے رہنے والوں میں جو عزت دار ہوتے ہیں ان کو ذلیل و خوار کیا کرتے ہیں اور یہ لوگ بھی ایسا ہی کریں گے۔

قرآن پاک نے بلقیس کی زبانی جو تبصرہ کیا ہے گو اس کا یہ تبصرہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق ہے اور وہ ایسے ملوک میں سے نہ تھے مگر اتنی بات ضرور ان کلمات سے مفہوم ہوتی ہے کہ ملوک کے متعلق عام طور پر نظریہ یہ چلا آ رہا ہے کہ وہ تعمیر کے بجائے اپنا رعب ڈالنے کے لئے اور مفتوحہ علاقے میں وہاں کے مؤثر طبقہ کا زور کم کرنے کے لئے عزت والوں کو ذلیل و رسوا کیا کرتے ہیں لیکن اگر ملوک میں سے کوئی فرد بندوں کے حقوق اور مالک الملک جل شانہ کے حقوق کا تحفظ کرتے ہوئے احکاماتِ خداوندی بندوں پر نافذ کرتا ہے تو ملوک کہلانے کے باوجود ایسا حکمران دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت شمار ہوگا۔

قابلِ تعریف ملوکیت

اللہ رب العالمین کے احکامات سے بے نیاز ہو کر چلنے والی ملوکیت کی جہاں مذمت ہے وہاں احادیث میں قابلِ تعریف ملوکیت اور بادشاہت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

چنانچہ مسلم شریف کی ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

السلطان ظل الله في الأرض — سلطان یعنی بادشاہ زمین میں اللہ تعالیٰ کا سایہ ہے

مَنْ اَكْرَمَهٗ اَكْرَمَهُ اللّٰهُ — جس نے اس کا اکرام کیا اللہ تعالیٰ اس کا اکرام کریں گے اور جس نے اسکی توہین کی اللہ تعالیٰ اسکی توہین کریں گے یعنی سزا دیں گے۔

وَمَنْ اَهَانَهٗ اَهَانَهُ اللّٰهُ۔

او کما قال علیہ السّلام۔

یہاں السّلطان میں الف لام عہدی ہے جس سے مراد صاحب تسلط بادشاہ ہے۔ حدیث کے الفاظ میں ایسے بادشاہ کی تعریف میں تین باتیں فرمائی گئی ہیں:

نمبر ۱: بادشاہ ملک میں اللہ تعالیٰ کا سایہ ہے۔

نمبر ۲: ایسے بادشاہ کا اکرام کرنا قابل تعریف ہے۔

نمبر ۳: ایسے عادل بادشاہ کی توہین سے ڈرایا گیا ہے کہ ایسے شخص کو اہانت کی سزا ہوگی۔

حدیث میں ظلّ اللہ کا مطلب

حدیث شریف میں ایک منصف بادشاہ کو اللہ تعالیٰ کا سایہ فرمایا گیا ہے ظاہر ہے یہ تعبیر مجازی ہے حقیقی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا نہ تو کوئی جسم ہے اور نہ سایہ۔ اسلئے کہ وہ جسم اور جسمانیات سے پاک ذات ہے۔ ایک مسلمان حاکم کو مجازاً اللہ تعالیٰ کا سایہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ کمالات اور عظمتوں کے مالک ہیں اور ایک مسلمان حاکم کو اللہ تعالیٰ کے کمالات کا مظہر ہونا چاہیئے جیساکہ حدیث قدسی میں ارشاد ہے۔ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ، کہ بندگی کی حدود میں رہ کر اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنانا ایک مسلمان کا شیوہ ہونا چاہیئے اور کمالات خداوندی میں ایک مسلمان حاکم کو اللہ تعالیٰ کا تابع اس طرح ہونا چاہیئے جیسے ایک سایہ اپنے اصل کے تابع ہوتا ہے۔ جیساکہ مشاہدہ میں ہے کہ ہر چیز کا سایہ

اپنے اصل کے تابع اور مطابق ہوتا ہے۔ اگر وہ چیز لمبی ہے تو سایہ لمبا ہوگا اور اگر چوڑی ہے تو سایہ بھی چوڑا ہوگا۔ اس بات کو واضح کرنے کے لئے ایک مسلمان بادشاہ کو حدیث میں مجازاً اللہ تعالیٰ کا سایہ فرمایا گیا ہے کہ مسلمان حکمران احکامات خداوندی کا اس طرح تابع ہوتا ہے جیسے سایہ اپنے اصل کا تابع ہوتا ہے۔ اب حدیث میں بعد والی عبارت کا انطباق بھی صاف ہوگیا ہے کہ جب مسلمان بادشاہ سایہ کی طرح اللہ تعالیٰ کا تابع اور کمالات کا مظہر ہوا تو اب جو اسکی توہین کریگا، وہ درحقیقت کمالاتِ الٰہی کی توہین ہوگی۔

نظامِ حکومت کا استحکام

دنیا کا کوئی بھی نظام اس وقت تک مستحکم اور مضبوط نہیں ہوتا جب تک اس نظام کے ٹوٹنے کا خطرہ باقی ہوتا ہے کسی نظام کا ٹوٹنا ہی اس کا بگاڑ ہے۔ سیاسی تفسیر میں اسی کو ہم فساد سے تعبیر کریں گے۔ اسلامی سیاست جس نظام کا نام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو مستحکم اور مضبوط کئے بغیر دنیا میں اس کا چلنا ممکن نہ ہوگا۔ اب دیکھنا یہ ہوگا کہ نظام کو کب خطرہ لاحق ہوتا ہے؟

عدمِ استحکام کا سبب

جب کسی ملک کے اندر اور باہر فساد ہو اسوقت حالات حکومت کے کنٹرول سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اور اسی کو عدم استحکام کہتے ہیں حکومت کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے داخلی اور خارجی فساد کا انسداد کرنا ضروری امر ہے۔ داخلی فساد تو یہ ہوتا ہے کہ اندرون ملک رعیت میں بغاوت کے جراثیم پرورش پاتے ہوں اور فساد خارجی یہ ہوتا ہے کہ بیرون ملک دشمن کے حملہ کا خطرہ ہو اور سرحدات غیر محفوظ ہوں۔ جب اندرونی اور بیرونی فساد کا انسداد ہوگا تو حکومت کا نظام شکست و ریخت

سے محفوظ ہو کر مستحکم ہو جائے گا۔

فساد داخلی کیسے برپا ہوتا ہے؟

داخلی فساد عوامی بغاوت کے نتیجے میں برپا ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ بغاوت کیسے شروع ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حکومت کے قوانین میں جب اعتدال نہیں ہوتا اور حکومت کے عمال (انتظامیہ) حقدار کو حق نہیں پہنچاتے تو اولاً عوام کے دلوں میں حکومت سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ابتداء میں یہ نفرت خیالات اور دلوں کی حد تک رہتی ہے۔ پھر ان خیالات کا اظہار زبان کرتی ہے۔ زبان ایک عظیم طاقت کا نام ہے جس کا مقابلہ ایٹم بم یا دوسرے ہتھیار بھی نہیں کر سکتے۔ کیا ماضی قریب کا یہ واقعہ ایک مسلمہ حقیقت نہیں ہے کہ لینن ایک بھٹیارا تھا جس نے صرف اپنی زبان کی طاقت سے زار روس کا تختہ الٹ دیا۔ اور پھر دنیا نے دیکھا کہ اس کرہ ارضی کے آدھے حصہ پر لینن کے اصولوں کی حکومت ہے میرے نزدیک یہ یقین کی فتح تھی۔ اور یقین ہمیشہ ہی فتح پاتا ہے اگرچہ کسی غلط بات پر ہی ہو۔ اور اگر کسی صحیح نظریئے پر یقین ہو تو پھر اللہ تعالےٰ کی تائید و نصرت بھی شامل ہوتی ہے۔

کیا قرآن پاک کی بیان کردہ حقیقت نہیں کہ فرعون کیخلاف حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کی صرف آواز ہی کامیاب ہوئی۔ یونہی نمرود کے خلاف سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی آواز نے کام کیا۔ اور پھر برصغیر سے انگریز صرف زبان کے اثر سے بھاگے یہاں کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔

یہ واقعات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ دنیا میں زبان کی آواز ایک

عظیم قوت ہے۔

الغرض جب نا اہل حکومت کے خلاف عوام کی زبانوں سے نفرت کا اظہار ہوتا ہے تو پھر عوام اس حکومت کا تختہ الٹ دیتے ہیں۔ اور یہ فسادِ داخلی کا نتیجہ ہے۔

فسادِ داخلی کا انسداد کیسے ہو

اب قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس اندرونی بگاڑ کے راستوں کو بند کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ تو سورۃ فاتحہ کی روشنی میں اس کے حل پر ہم توجہ دیتے ہیں۔

ایک اسلامی ریاست کے حکمرانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے طریقہ پر اپنی سیاست کو چلائیں۔ تاکہ اندرون ملک فساد نہ ہو اس ضمن میں انکو ایسے کام کرنے ہوں گے جن سے عوام نفرت کے اظہار کے بجائے حکومت کی کارکردگی اور اچھے طرز عمل کی بنیاد پر حکام کی تعریف میں رطب اللسان ہوں۔ جب عوام کی زبانیں تعریف کریں گی تو ریاست کے اندر فساد کے راستے مسدود ہونگے۔

سورۃ فاتحہ کی روشنی میں عوام کی زبانوں کو مسخر کرنے کا اشارہ سورۃ کے پہلے جملے " الحمد للہ " سے معلوم ہوتا ہے۔ یعنی سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ جس طرح کائنات جو اللہ کی رعیت ہے سوائے چند احمقوں کے سب ہی اللہ تعالیٰ کے حامد رہے ہیں، اللہ کی ذات ممدوح رہی ہے مذموم نہیں اسی طرح ایک اسلامی ریاست کے حکمران کو اپنی رعیت کے ساتھ اس طرح پیش آنا چاہئے کہ حکمران قابل تعریف کاموں کی وجہ سے محمود خلائق بن جائیں۔ تو اس صورت میں اندرون ملک بغاوت و شورش کا امکان نہ رہے گا۔ یعنی فساد داخلی کا انسداد

ہو جائے گا۔

تسخیرِ لسان مع تسخیرِ جنان

تسخیر لسان کے ساتھ ساتھ تسخیر جنان بھی ضروری ہے کیوں کہ جب ایک مملکت میں فسادِ داخلی کا انسداد یہ ہے کہ عوام کی زبانیں حکمرانوں کی برائیوں کے بجائے ان کی تعریفیں کریں تو زبان دِل کی ترجمان ہوتی ہے۔ جب دِل ساتھ نہیں دیتا تو زبان سے کسی کی تعریف کیسے نکل سکتی ہے؟ اسلئے زبانوں کو مسخر کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ پہلے دِل مسخر کئے جائیں۔ دِل خوش ہوگا تو زبان سے خوش کن الفاظ جاری ہوں گے۔

سیاست میں تسخیرِ جنان کے اصول

یعنی اسلامی سیاست میں رعیت کے دلوں کو مسخر کرنا ایک لازمی امر ہے چنانچہ کسی ریاست میں عوام کے دلوں کو خوش رکھنے کے لئے کئی اصول ہیں، پہلی اصل اور ضابطے کا نام سورۃ فاتحہ کی روشنی میں "تربیت عامہ" ہے جس کا ماخذ سورۃ کا دوسرا جملہ "رب العالمین" ہے۔ یعنی وہ اللہ تمام جہانوں کی پرورش کرنے والے ہیں۔ اسی تربیت عامہ میں یہ بھی داخل ہے کہ رعیت میں کوئی بھوکا نہ رہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ سب ہی کو کھانا دیتے ہیں جن میں انسانوں کے علاوہ چرند پرند خشکی وتری کے سب جاندار شامل ہیں۔ اور وہ جانور بھی جو بظاہر دُنیا میں مضرت ونقصان کا سبب بنتے ہیں، کھانا ان کو بھی ملتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ انسان جو اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتے ان کو بھی کھانے سے محروم نہیں رکھا جاتا، اسلامی ریاست کے مُسلمان حکمران کو اپنی حدود میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی

صفت ربّ العالمین کا مظہر بننا چاہیئے ۔ اسلامی تاریخ میں خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا یہ قول مسلمان حکمرانوں کے لئے مشعل راہ ہے فرمایا :

"لَوْ مَاتَ الْكَلْبُ عَلَى شَطِّ فُرَاتٍ جُوعًا لَكَانَ عُمَرُ مَسْئُولًا عَنْهُ"

"اگر نہر فرات کے کنارے پر ایک کتا بھوک سے مرجائے تو عمر بن خطاب سے اسکے متعلق پوچھا جائے گا۔"

تربیتِ عامہ میں یہ بھی داخل ہے کہ اگر کوئی شخص کسی معذوری کی وجہ سے اکتساب رزق ومعاش پر قادر نہ ہو تو اسکی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اسلامی ریاست کے بیت المال سے وظیفہ دیا جائیگا ۔ اسلامی دور میں ریاست نہ صرف مسلمانوں کا خیال رکھتی بلکہ غیر مسلم بھی جنکو ذمّی کہا جاتا ہے اسلام کے اس سنہری اصول سے فائدہ اٹھاتے تھے ۔ چنانچہ قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کتاب الخراج میں نقل کیا ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے ایک یہودی ذمّی حاضر ہوا اور شکایت کی کہ میں بھوکا ہوں اور میرا وظیفہ حکومت کے ذمے ہے مگر مجھے میرا حق نہیں ملا ۔ سیدنا حضرت فاروقِ اعظم نے فوراً وظیفہ کی ادائیگی اور تحقیق احوال کا حکم دیا ۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ حاکم شہر نے اسکو وظیفہ پہنچانے کے لئے کئی بار آدمی بھیجے لیکن یہ شہر چھوڑ کر چلا گیا اور حاکم شہر کو اطلاع بھی نہیں دی۔

اس موقع پر حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گورنروں کے نام ایک فرمان عام جاری کیا جو سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل ہے ، الفاظ یہ تھے ۔

أَيُّمَا ذِمِّيٍّ أَوْ ذِمِّيَّةٍ افْتَقَرَ — جو ذمّی مرد یا عورت محتاج ہوجائے

(او) ضعف عن العمل طرح عنه الجزیة وعیل هو واهله وأنفق علیه من بیت مال المسلمین ما داموا في دار الاسلام فإذا اخرجوا من دار الاسلام فلا نفقة لهم۔

(کتاب الخراج)

یا کمزوری کی وجہ سے کام کے قابل نہ رہے تو اس کا ٹیکس (جزیہ) معاف کر دیا جائے گا۔ اسکی اور اُسکے گھر والوں کی ذمہ داری حکومت پر ہوگی اور مسلمانوں کے بیت المال سے اس پر خرچ کیا جائیگا جب تک یہ اسلامی ریاست میں رہے۔ اور جب اسلامی ریاست سے نکل جائیں تو پھر ان کے نفقہ کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر نہ ہوگی۔

٭ ٭ ٭

اسلامی ریاست میں تربیت عامہ کی یہ ایک عظیم مثال ہے۔ عمومی تربیت میں کھانا پینا، علاج اور رہائش کی تمام ضرورتیں داخل ہیں جسمیں مُسلم وغیر مُسلم کا امتیاز بھی نہیں ہے۔

۴ اعداد فوائد دُنیویہ | تربیتِ عامہ کے بعد دوسری اصل یہ ہے کہ عوام یا رعیت کے کھانے پینے، رہنے سہنے کی ضروریات مہیا کرنے کے بعد ان کی دیگر دُنیاوی ضرورتوں کی طرف بھی خصوصی توجہ دی جائے مثلاً ملک کے زرعی نظام کو مستحکم کیا جائے۔ اسی طرح تجارتی نظام اور صنعتی نظام کو مضبوط بنیادوں پر چلایا جائے اور یہ بات یقینی بنائی جائے کہ صنعت و تجارت کے میدان میں کسی خاص طبقے کو خصوصی مراعات سے نوازنے کے بجائے ملک کا ہر شہری قواعد و ضوابط کے اندر رہ کر صنعت و تجارت اور زراعت کے میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہوئے ترقی کر سکے۔ اسی طرح عدالتی نظام ایسا ہو کہ رعیت کے ہر فرد کو انصاف

فوری اور مفت مل سکے۔ زندگی کے ان تمام میادین میں مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں ایسی ترقی کی تھی جس کی نظیر کا ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ آج مسلمان جس حالت میں ہیں یہ ترک اسلام کا نتیجہ ہے۔

مسلمان مملکت میں زندگی کے ان میدانوں میں قابل رشک واقعات تاریخ کے صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں جب قحط پڑا تو تنگی کے ان ایام میں امیر المومنین نے گوشت اور گھی ترک کر دیا۔ اور لوگوں کے اصرار کرنے پر فرمایا کہ جب تک پوری مملکت کے طول وعرض سے یہ اطلاع نہ آ جائے کہ گھی اور گوشت ہر شخص کو میسر ہے میں اس وقت تک ان کا استعمال نہ کروں گا۔

"مستطرف" میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بدو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں مہمان ہوا، کھانا سامنے آیا تو خلیفۂ وقت کے گھر کی جو کی روٹی اتنی سخت تھی کہ اس کے حلق سے نہ اترتی تھی۔

اسی طرح سیرۃ العمرین میں ابن جوزی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں بچوں کے دودھ چھڑانے کا وقت آتا تو ان کا وظیفہ مقرر کیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رات کو گشت کرتے ہوئے ایک گھر کے پاس سے گزرے تو ایک بچے کی چیخ و پکار سنی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بچہ کا دودھ قبل از وقت چھڑایا جا رہا ہے تاکہ وظیفہ مقرر ہو سکے۔ گھر لوٹے تو چین نہ آیا۔ صبح ہوتے ہی نیا قانون جاری کیا کہ بچہ پیدا ہوتے ہی اس کا وظیفہ مقرر کیا جائے۔ اور تاریخ نے اس بات کو بھی نوٹ کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے بعد روتے ہوئے فرماتے جاتے تھے کہ میں نے مسلمانوں کے بچوں کے

حقوق تلف کئے ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ پہلا قانون بھی عقل کے مطابق تھا لیکن مسلمان حکمرانوں کو اس واقعہ میں احساسِ ذمہ داری کا سبق دیا گیا ہے۔

مشہور فاتح سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ تعالیٰ جس نے انیس یورپی سلطنتوں کو فتح کیا تھا اس کی اپنی ذاتی حالت یہ تھی کہ وفات کے وقت گھر کا کل اثاثہ پینتالیس درہم تھا جو پاکستانی سکّے کے حساب سے بارہ یا تیرہ روپے بنتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ سلطان کی دیانت داری قابلِ رشک تھی کہ انہوں نے ملکی دولت کو سمیٹنے کے بجائے رعیت و عوام کی امانت سمجھا تھا۔ جہاد میں جو گھوڑا استعمال ہوتا تھا وہ مستعار تھا خود خریدنے کی طاقت نہ تھی جہاد سے واپسی پر وہ گھوڑا مالک کو لوٹا دیتے تھے حقیقت یہ ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی اس شعر کا مصداق تھے ؎

آں مسلمانان کہ میری کردہ اند — در شہنشاہی فقیری کردہ اند

سید جمال الدین افغانی فرمایا کرتے تھے مجھے اگر ایک ضلع پر مکمل اختیارات دے دیئے جائیں تو میں وہاں اسلامی قانون نافذ کرکے بتا سکتا ہوں کہ آج کے دور میں تمام بیماریوں کا واحد علاج اسلامی قوانین کا نفاذ ہے۔ دورِ حاضر میں دنیا پر یا تو سرمایہ داریت کی لعنت مسلط ہے یا اشتراکیت کا عفریت۔ دونوں میں ہی افراط و تفریط ہے۔ اشتراکیت میں مساوات کا شور مچا کر انسانوں کے ساتھ حیوانوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کے ہاں انصاف نام کی کوئی چیز نہیں۔ روس کے سٹالن کی تنخواہ نو لاکھ روبل تھی جبکہ ایک چھوٹے ملازم کو بمشکل پانچ ہزار روبل ملتے ہیں۔ ایسی صورت میں جبکہ کمر توڑ مہنگائی بھی ہو کوئی چھوٹا ملازم کیسے گزارہ کر سکتا ہے؟ یہ تو انصاف کے نام پر ناانصافی کا مظاہرہ ہے۔ سرمایہ داریت نے بے لگام معیشت کے ذریعہ

دنیا میں فساد مچا رکھا ہے، جبکہ اسلام نے جائز و ناجائز حلال و حرام کی قدغن لگا کر معیشت کو بے لگام نہیں چھوڑا۔ ان شرائط کے ہونے ہوئے نا انصافی کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔

الحاصل دنیاوی فوائد ایک اسلامی ریاست میں کسی جماعت یا فرد کے لئے خاص نہیں ہوتے بلکہ رعیت و عوام کے مشترک مفادات ہوتے ہیں۔ حکومت امین کی حیثیت سے ہر حقدار کو حق پہنچانے کا انتظام کرتی ہے۔

اسلامی سیاست میں رعیت کے دلوں کو مسخر کرنے کے اصولوں میں ایک اصل یہ ہے کہ حکمران ان کی دنیاوی ضرورتوں کا خیال رکھیں اس کا ماخذ سورۃ فاتحہ میں الرحمٰن ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمتِ دنیوی کی طرف مشیر ہے جب اللہ تعالیٰ اپنی رعیت یعنی ساری مخلوق کے ساتھ رحمت کا سلوک فرماتے ہیں تو ایک مسلمان حکمران کو اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا مظہر بنتے ہوئے اپنی رعیت کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کرنا چاہیئے۔

(۳) اعدادِ فوائدِ دینیہ انسانوں کی ضرورتوں میں ایک اہم ضرورت دین بھی ہے۔ خصوصاً مسلمان معاشرے میں حکومت کا فرض ہے کہ وہ جہاں عوام کی دنیاوی ضرورتوں کے ذمہ دار ہیں۔ وہاں ان کے دینی فوائد اور ضرورتوں کا خیال رکھنا ان کے فرضِ منصبی میں داخل ہے۔ ان دینی ضرورتوں میں اہم شعبہ تعلیم اسلام کا ہے۔ اسلامی تعلیمات کو فروغ دینا اسلامی ریاست کے فرائض میں شامل ہے۔ اسی طرح اسلام کی تبلیغ کرنا، اسلامی احکامات کے تحفظ کا انتظام، اسلامی لٹریچر کی اشاعت اور اسلامی تعلیمات کے اداروں کا قیام تحفظ دین کے لئے ضروری ہے۔ قرآن و سنت جو دین کی بنیاد ہے کو مسلمانوں تک پہنچانا اسلامی حکومت کا فرض ہے۔

لمحۂ فکریہ ماضی قریب میں متحدہ ہندوستان میں جو مسلمانوں کا دورِ انحطاط

تھا اُس میں حکومتِ افغانستان کا یہ حال تھا کہ وہاں قرآن چھاپنے کا کوئی مطبع نہ تھا۔ بلکہ اس
دور میں پشاور کے کھڑک سنگھ اور گلاب سنگھ قرآن مجید طبع کیا کرتے تھے۔ افغانستان کی
حکومت کو جب ضرورت پڑتی ان سے خرید لیتی۔ اور خود مطابع قائم کرنے کا اسے خیال نہ تھا۔
صرف پشاور ہی کی بات نہیں بلکہ دُوسرے علاقوں میں بھی یہی حال تھا۔ چنانچہ پچانوے
فیصد اسلامی کُتب منشی نولکشور کی مطبوعہ ہیں۔ نولکشور کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ وہ روزانہ
ایک ہزار روپیاں فقراء میں تقسیم کرتا تھا۔ اور یہ بھی کہا کرتا تھا کہ میں نے یہ دولت ان غریب
داروں کے ذریعہ ہی کمائی ہے اسلئے میری کمائی میں یہ بھی شریک ہیں۔ سچ کہا گیا ہے

ع جو کام مسلمانوں کے تھے وہ کام مسلماں بھول گئے

اسلامی ریاست کے حکمران اپنی رعیت کے دین کے بھی ذمہ دار ہیں،
وہ ملک کے اندر دینی ماحول پیدا کریں۔ سورۃ فاتحہ کی سیاسی تفسیر کے ضمن میں "الرحیم"
سے اس کا استنباط کیا جاسکتا ہے کہ رحیم اللہ تعالیٰ کی وہ صفت ہے جس کا تعلق آخرت
کی رحمتوں سے ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ آخرت کی تمام نعمتیں دین سے وابستہ
ہیں۔ اگر دنیا میں دین پر کماحقہ عمل کیا گیا تو جنّت اور اسکی کل نعمتیں ان عمل کرنیوالوں کو
ملیں گی۔

(۴) انصاف مہیا کرنا ایک اسلامی ریاست میں اندرونِ ملک بگاڑ کو
دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ رعیت کو فوری اور سستا انصاف مہیا کیا جائے

ورنہ جب عوام کی حق تلفی ہوگی اور انہیں اپنے حقوق نہیں ملیں گے تو ملک میں داخلی سطح پر اطمینان و سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس اصل کا استخراج سورۃ فاتحہ کی آیۃ مالك یوم الدین سے ہوتا ہے جس کا معنی ہے ہمارا رب انصاف کے دن کا مالک ہے۔ وہ ایک دن اپنے بندوں میں انصاف سے فیصلہ فرمائے گا۔ مجرموں کو سزا دی جائے گی اور فرمانبرداروں کو انعام دیا جائے گا۔ اسی طرح اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ملک میں داخلی فساد کے خاتمہ کے لئے تعزیری قوانین اور حدود اسلامی کا سختی سے نفاذ کرے۔ تاکہ مظلوموں کو انصاف مہیا ہو اور مجرموں کو عبرتناک سزائیں سرعام دی جائیں مثلاً چور کے ہاتھ کاٹنے یا زانی کو کوڑے یا سنگسار سرعام کیا جائے تو جرائم کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اور اس طرح فساد داخلی کا انسداد ممکن ہوگا۔ اندرون ملک فساد کو ختم کرنے کیلئے ہی فقہاء امت نے لکھا ہے کہ " الساعی بالفساد یقتل سیاسۃ " کہ جو فساد اور تخریب کاری میں پکڑا جائے اسے قصاصاً نہیں بلکہ سیاستاً قتل کیا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ شریعت کی نظر میں لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اسلامی حکومت کی ایک اہم ذمہ داری ہے۔

فسادِ خارجی ایک حکومت کے استحکام کے لئے جس طرح فسادِ داخلی کا انسداد ضروری ہے اسی طرح فسادِ خارجی کا انسداد بھی لازمی امر ہے۔ فساد خارجی یہ ہوتا ہے کہ کسی ملک کی سرحدیں محفوظ نہ ہوں۔ اور دشمن کے حملے کا خطرہ موجود ہو۔ یہ خطرہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی ملک کے مرکز میں ضعف اور کمزوری آجائے۔ اگر مرکز مضبوط ہو تو دشمن کی حوصلہ شکنی ہوگی اور بیرونی حملے کا امکان کم ہوگا۔ اسی کا نام انسداد فساد خارجی ہے۔

انسداد فساد خارجی

فسادِ خارجی کو روکنے کے لئے ملک کا مضبوط ہونا ضروری
ہے جس کا انحصار مرکزِ اطاعت کے متحد ہونے پر ہے۔ جب مرکزِ اطاعت ایک ہوگا تو
یا ملک یقیناً مستحکم اور مضبوط رہے گا۔ ورنہ طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوگا۔ جو کسی بھی
رت کے لئے خطرے کا الارم ہوتا ہے۔ مرکزِ اطاعت کے متحد ہونے اور نہ ہونے
ے نتائج کو سمجھنے کے لئے عالمی تاریخ کے چند اجمالی واقعات کا ذکر مناسب ہوگا۔

مرکزِ اطاعت ایک نہ ہونے کے نتائج عالمی واقعات کی روشنی میں

(ا) دوسری جنگ عظیم کے دوران کسی نے سر ولیم سے پوچھا: جنگ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے فوراً جواب دیا کہ جو چرچل کا خیال ہے وہی ہمارا خیال ہے مطلب یہ تھا کہ جو چرچل کی سوچ ہے وہی ہماری سوچ ہے۔ مرکزِ اطاعت کی وحدت اسی کو کہتے ہیں۔ آج ہماری حالت تو یہ ہو چکی ہے کہ دو کھوپڑیاں بھی باہم متفق نہیں ایسی صورت میں کسی حکومت یا جماعت کے استحکام کا تصور بھی کیسے کیا جا سکتا ہے؟

(۲) یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مرکزِ اطاعت کی وحدت کی برکت سے ہی مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک سپین پر حکومت کی۔ اور ان کی حکومت دنیا کی کامیاب ترین حکومتوں میں سے ایک تھی۔ جس میں جلیل القدر علماء، صوفیاء، حکماء، متکلمین، اور فلسفی پیدا ہوئے۔ چنانچہ یورپ کے شہزادے اس زمانہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے سپین جایا کرتے تھے۔ لیکن اس عظیم حکومت میں جب

مرکزِ اطاعت کی وحدت برقرار نہ رہ سکی اور عیسائیوں کی شرارت سے عرب کے مسلمان حکمرانوں میں مضری اور یمنی قبائل کے اختلافات پیدا ہو گئے تو پھر اس عظیم مضبوط اسلامی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ عیسائی قابضین نے مسلمانوں میں یہ اعلان کر دیا کہ اب تم کو ان تین میں سے ایک بات کو قبول کرنا ہوگا۔

(۱) ترکِ اسلام

(۲) ترکِ وطن

(۳) تلوار کا سامنا

پھر عیسائیوں نے سپین میں مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے۔ تاریخ کے اوراق میں وہ واقعات محفوظ ہیں، جن کو پڑھ کر ایک منصف مزاج انسان کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ یہ واقعہ ۱۴۰۰ء عیسوی کا ہے۔ عیسائیوں کے مظالم کو شعراء نے اپنے حزینہ قصیدوں میں بیان کیا ہے۔ ایک قصیدے کا صرف ایک شعر بطور نمونہ یہ ہے ؎

لمثل هذا يذوب القلب من كمد

ان كان في القلب اسلام وايمان

"اس طرح کے غمناک واقعات پر ایک دل پگھل کر رہ جاتا

ہے اگر دل میں اسلام و ایمان کی حرارت موجود ہو۔"

بغداد کے سات سو سالہ دورِ عباسیہ میں مسلمانوں نے آدھی دنیا پر حکومت کی ہے، بغداد کے آخری خلیفہ معتصم باللہ کا وزیر ابن علقمی غدار تھا۔ اسی ابن علقمی نے ہلاکو خان کو خط لکھا کہ ایک عظیم حکومت تمہارے انتظار میں ہے۔ ہلاکو جیسا ظالم، جری اور بہادر ہونے کے باوجود بغداد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

[...] اسلامی حکومت کا رعب اسکے دل پر بھی تھا۔ اسلئے اسلامی حکومت کی اسقدر [کمزوری] پر یقین نہ آیا۔ تو اس نے نصیر طوسی (علیہ اللعنۃ الف الف مرۃ) جو محقق طوسی کہلاتا ہے کو [بغداد] کی حکومت کے احوال معلوم کرنے کیلئے ہلاکو خان نے بھیجا۔ چنانچہ اس ملعون کی رپورٹ [پر] آخر کار ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا۔ پھر کیا ہوا؟

ابن الاثیر مشہور مورخ سقوط بغداد کے واقعات لکھتے ہوئے کہتا ہے:

> یہ حالات لکھتے ہوئے میری انگلیاں لرز رہی ہیں، ہاتھ کانپ رہے ہیں، دل لکھنے کی ہمت نہیں کرسکتا........ واقعی سقوط بغداد تاریخ اسلام کا ایک عظیم حادثہ تھا۔

سقوط بغداد کے حادثہ میں ہلاکو خان نے صرف ایک دن میں دس لاکھ مسلمانوں کو تہ تیغ کیا۔ عباسی شہزادوں اور شہزادیوں کو گھوڑوں کے سموں کے نیچے کچل دیا گیا۔ علماء، صوفیاء، حکماء، سب کو دعوت کے بہانے بلا کر تہ تیغ کر دیا گیا۔ بقول مورخین ان میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ مسلمانوں کی قلمی کتب کو جب دریائے دجلہ میں پھینک دیا گیا تو ان کی روشنائی کیوجہ سے تین دن تک دریا کا پانی سیاہ ہو کر بہتا رہا۔

یہ سب کچھ اسلئے ہوا کہ اسلامی حکومت کا مرکز اتحاد کے بجائے انتشار کا شکار ہو کر کمزور ہو گیا تھا۔ اور حکمران جماعت میں سے ہر ایک من مانی کارروائیاں کر رہا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرکز اطاعت ایک نہ ہونے کی وجہ سے بیرونی حملہ آور دشمن نے ایک عظیم اسلامی سلطنت کو تاراج کر دیا۔

اسی طرح دنیا میں اسلامی حکومتوں کو آپس کے انتشار کی وجہ سے تہ و بالا کر

دیا گیا۔ بنگال میں جعفر، دکن میں صادق، دہلی میں مرزا الٰہی بخش جیسے غداروں کی کارروائی کس تاریخ پڑھنے والے سے مخفی ہے؟ مسلم حکومتوں کے تاج و تخت کے زوال کا سبب اسلام کا نام لینے والے منافق اور غدار ٹولہ بنا۔

فاعتبروا یا اُولی الأبصار [۱]

مرزا الٰہی بخش، مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کا معتمد خاص تھا۔ رنگ سفید تھا اور چہرے پر داڑھی بھی طویل تھی کہ دیکھنے والا اسکو جُنید سمجھنے لگے۔ لیکن یہ شخص انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔ انگریزوں نے ہی اسکو یہ سبق پڑھایا تھا کہ بادشاہ کو انگریزوں سے مقابلہ اور جنگ کرنے سے روکا جائے۔ چنانچہ اس غدار نے بہادر شاہ ظفر کو دھوکے میں رکھا۔ جب انگریزوں کا دہلی پر مکمل تسلّط ہو گیا تو شہزادوں کو انگریز افسر نے پستول سے مارا اور پھر سر کاٹ کر بہادر شاہ ظفر کے پاس بھجوا دیئے۔ اس واقعہ

---

[۱] ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے شیخ مجیب الرحمن اور مغربی پاکستان کے ذوالفقار علی بھٹو کے باہم اقتدار کی کشمکش کے نتیجے میں جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا اور سقوط ڈھاکہ کا المیہ سامنے آیا، تو ملک کے باشعور افراد اس حادثہ پر پریشان تھے تو ملک کے مشہور محدث راقم الحروف کے استاذ گرامی حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ ایک دن جمعہ کے اجتماع میں مسجد نیلا گنبد میں خطاب فرما رہے تھے۔ دوران خطاب اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے علامہ اقبال کا شعر یوں پڑھا۔

جعفر از بنگال صادق از دکن | خان یحییٰ را ببین دریں زمن

یہ دوسرا مصرع مولانا مرحوم نے خود لگایا تھا اور پھر اسلامی حکومتوں کے زوال کے مندرجہ بالا واقعات بھی بیان فرمائے تھے۔ (مرتب)

...بی عجیب بات یہ ہے کہ بہادر شاہ اس حالت کو دیکھ کر رو یا نہیں بلکہ صبر و استقامت
...کی بے مثال قائم کی۔ صرف اتنا کیا جسے تاریخ نے محفوظ رکھا۔

" اولادِ تیمور دستے کہ آیند سرخ رو آیند "۔

" یعنی تیمور کی اولاد جب بھی آتی ہے سرخرو آتی ہے یہ تیموری خاندان ہے۔"

اگرچہ تاریخ میں تیمور ظالم مشہور ہے جس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا
ہے کہ صاحب حصن حصین نے جو ادعیہ ماثورہ کو جمع کیا ہے۔ اسمیں بھی یہ لکھا ہے کہ یہ دعائیں
پڑھ کر تیمور کی ہلاکت کی دعا کریں لیکن تیمور کے کارناموں میں اس کا بھی ذکر ہے کہ اس نے
تبلیغ اسلام اور پھر کفر کے خلاف جہاد بھی کیا۔ چنانچہ سمرقند سے لیکر گلگت تک کا علاقہ فتح
کیا اور یہاں کے رہنے والوں کو مشرف بااسلام کیا پھر اسکے بعد یورپ پر حملہ کیا تو صرف
پندرہ دنوں میں آدھا یورپ فتح کر لیا۔ اسی اثنار میں کچھ علمار کی جانب سے کفر کا فتویٰ
لگا یا گیا اس نے علمار سے کہا کہ صرف ایک ماہ کی مہلت دے دو تاکہ بقیہ یورپ بھی
فتح کر لوں پھر جو تمہاری مرضی میں آئے وہ کرنا لیکن مولوی ماننے والے کہاں تھے؟

تواریخ میں مشہور ہے کہ فاتح تین گزرے ہیں :

(۱) حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ

(۲) تیمور اعظم (۳) نپولین

الغرض ان عظیم الشان اسلامی سلطنتوں کی تاریخ پڑھنے سے معلوم
ہوتا ہے کہ زوال حکومت کا سبب ہمیشہ انتشار مرکز رہا ہے۔ اسلامی حکومت کا مرکز
ایک ہونا چاہیئے پھر اسکی اطاعت کی جائے تو حکومت کو استحکام ملتا ہے۔

اس کا ماخذ ہے۔ کہ جیسے عبادت صرف اللہ کی ہے اور استعانت بھی اسی سے طلب کی جاتی ہے اسلئے حصر کے ساتھ فرمایا گیا ہے اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ اسی طرح ایک اسلامی حکومت کو اس کا مظہر بننا چاہیئے کہ انتخاب خلیفہ میں تو خوب غور و خوض کیا جائے لیکن انعقاد خلافت کے بعد اطاعت صرف مرکزی حکومت کی ہونی چاہیئے تاکہ ایک اسلامی حکومت کو بیرونی دشمنوں کا خطرہ نہ رہے بلکہ ان پر مضبوط اسلامی حکومت کا رُعب رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی حکومتوں کو جب بھی نقصان پہنچا ہے تو اسکی بنیادی وجہ صرف یہ رہی ہے کہ اطاعت کا مرکز ایک نہیں ہوتا بلکہ صورتحال یہانتک بگڑ جاتی ہے کہ ایک شخص دہلی سے پنجاب یا بنگال کے لئے گورنری کے عہدے کا حکم لیکر چلتا ہے تو راستے میں ہی اس کا دماغ بگڑ جاتا ہے اور پھر وہاں پہنچ کر اس علاقے میں خودمختاری کا اعلان کر کے بادشاہ بن جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے دلوں میں مرکز کی اطاعت نہ ہوتی تھی۔ تاریخ کا یہ بھی ایک تجربہ ہے کہ ان کے مقابلے میں ہندوستان پر تقریباً دو سو سال انگریزوں نے حکومت کی۔ ان کی حالت یہ تھی کہ ہزاروں میل دور انگلستان سے ایک شخص وائسرائے ہند بن کر آتا تھا لیکن اسکے دل میں یہ خیال نہ آتا تھا کہ میں ہندوستان میں خودمختاری کا دعوای کردوں۔ یہی وجہ تھی کہ عرصۂ دراز تک انگریز ہندوستان پر حکومت کر گئے اور ایک عیسائی محقق نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے رگ و پے میں اختلاف اس طرح رچا ہوا ہے جس طرح طاعون کا مرض ایک انسانی جسم میں ہوتا ہے۔ بات سچی ہے اگرچہ ہمیں کڑوی معلوم ہو۔

نصب العین اساسی مسلمانوں کی زندگی کا اصل مقصد ملت اسلامیہ کے
دائرہ کی توسیع ہونا چاہیئے - یعنی تبلیغ اسلام کیلئے کوشاں رہیں - ایک اسلامی حکومت کے
ادنیٰ ملازم مثلاً چپڑاسی سے لیکر صدر مملکت تک سب کے دل و دماغ میں یہ نصب العین
رچا بسا ہو - اور حکومت کی پوری مشینری تبلیغ اسلام یا دوسرے لفظوں میں توسیع دائرہ
ملت کے لئے ہر وقت سرگرم عمل ہو - تب جاکر اسلامی سیاست کے نتائج برآمد ہونگے -

اسلامی سیاست کے اس نصب العین اساسی کا ماخذ سورۃ فاتحہ میں
اِھدِنَا سے سورۃ فاتحہ کے آخر تک ہے - قرآن پاک کے ان جملوں سے ہمیں یہ سبق
ملتا ہے کہ اللہ رب العالمین سے مانگنے کی چیز صرف ہدایت ہے - لیکن مطلق ہدایت
نہیں بلکہ انعام یافتہ حضرات والی ہدایت اور بارگاہِ خداوندی کے مقبولین کی سی ہدایت
کے ہم طالب ہیں - جہاں تک مردود دین کا راستہ ہے تو ہمیں اس سے اجتناب کا حکم
دیا گیا ہے - الغرض حکومتِ اسلامیہ کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے :

اخراج الافراد الانسانیۃ	افراد ملتِ انسانی کو مغضوبین اور ضالین
من المغضوبین والضالین	میں سے نکالنا اور انعام یافتہ حضرات
وادخالھم فی المنعمین .	میں ان کو داخل کرنا -

یعنی منعمین کی تعداد میں اضافہ ہو اور مغضوبین وضالین کی تعداد میں کمی
ہو - یہ ہے اسلامی ریاست کا نصب العین اساسی .

جہاد : نصب العین کے حصول کا ذریعہ سورۃ فاتحہ کے آخری جملوں

ہمارے لئے سیاسی سبق یہ ہے کہ جو افراد اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبولین شمار ہوتے ہیں وہ ہمارے ہاں بھی مقبول ہوں اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مغضوبین اور ضالین کی فہرست میں ہیں وہ ہمارے بھی مغضوب ہوں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اسلام نے مسلمانوں کو جہاد کا حکم دیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جب یہ سوال ہوا کہ مجاہد کسے کہتے ہیں؟ تو جواباً ارشاد فرمایا:

من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا۔ یعنی جو کفر کے ساتھ صرف اسلئے لڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کا بول بالا ہو۔

اس مقصد پر حقیقی عمل صرف ابتدائی پچاس سالوں میں ہوا۔ اگر مزید پچاس سال تک اسلامی جہاد جاری رہتا تو آج ساری دنیا مسلمان ہوتی یہ واقعہ ہمارے سامنے کا ہے کہ روس نے اشتراکیت کو دنیا کا مقصد جان کر پھیلایا۔ لینن نے تحریک چلائی تو آج آدھی دنیا پر اشتراکی نظریے کی حکومت چل رہی ہے۔

صحابہ کرامؓ ملکوں کے ساتھ دلوں کو بھی فتح کرتے تھے

کاش مسلمان دینِ حق کے نظریات کو اپنے دین اور دنیا کا مقصد سمجھتے ہوئے انہیں پھیلانے کی کوشش کرتے اور ملتِ اسلامیہ کا دائرہ وسیع کرتے تو موجودہ دور میں مسلمانوں کو جن مشکلات کا سامنا ہے یہ بُرے دن ہمیں نہ دیکھنے پڑتے۔ جبکہ ہمارے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ اسوہ ہمارے سامنے ہے۔ کہ آپ نے اپنے مخلص شاگردان اوّلین کو جب جہاد کا سبق پڑھایا تو پھر اسے

قیامت تک جاری رکھنے کی ترغیب دی اور فرمایا:

الجہاد ماض الیٰ یوم القیامۃ جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔

اسکو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم نے مقصدِ زندگی سمجھتے ہوئے جاری رکھا تو اس کا ایک واضح نتیجہ ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ صحابہ کرام نے جو غیر عرب علاقے فتح کئے تو یہ صرف ملکوں ہی کو فتح نہ کیا تھا بلکہ اسکے ساتھ لوگوں کے دلوں کو فتح کر لیا تھا چنانچہ ان مفتوحہ اقوام کی زبان تہذیب اور مذہب پر بھی اثر انداز ہوئے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ عراق، مصر، مراکش، الجزائر اور دیگر بیسیوں وہ ملک جو آج عرب ملک کہلاتے ہیں۔ اسلامی فتوحات سے قبل ان کی زبان عربی نہ تھی جبکہ اب ان ملکوں کی مادری اور سرکاری زبان عربی ہے۔ اور آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ یہ صحابہ کرام کے جہاد کا اثر ہے اور اُن کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے دور میں ایران بلوچستان، سندھ، مکران، پنجاب مشرقی اور مغربی بنگال فتح ہوئے ان علاقوں کی اگرچہ زبان تو نہ بدلی لیکن رسم الخط پر ضرور اثر پڑا۔ چنانچہ فارسی، پشتو براہوئی، پنجابی اور سندھی زبانوں کا رسم الخط عربی ہی ہے اور پھر مزید برآں دوسرا اثر یہ پڑا کہ ان غیر عربی زبانوں میں عربی الفاظ کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہو گئی سب سے زیادہ عربی الفاظ سندھی زبان میں داخل ہیں۔ آج کے سندھی اخبارات اور سندھی ادب پر شائع ہونے والی کتب اسکی شاہد عدل ہیں۔ تیسرا اثر عرب فاتحین کا ان علاقوں پر یہ ہوا کہ ان علاقوں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اور اسی کا اثر ہمارے سامنے یہ بھی ظاہر ہوا کہ متحدہ ہندوستان کی تقسیم کے نتیجہ میں پاکستان جیسی ایک عظیم اسلامی مملکت وجود میں آئی۔

تقسیم کا فارمولا یہ تھا کہ متحدہ ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ پاکستان میں شامل ہوں گے تو جن عرب مسلمانوں نے ان علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت بنانے کے لئے محنت کی تو انہوں نے ہی حقیقت میں پاکستان کی بنیاد فراہم کی۔ اسی طرح روس کے علاقے ثمرقند، تاشقند، بخارا، کاشغر میں ابھی تک مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

ایک فرانسیسی ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ یہ عجیب بات ہے کہ عربوں کے قدم جہاں بھی گئے وہاں آج تک مسلمانوں کی اکثریت ہے:

وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ۔ اصل فضیلت وہ ہے جس کا دشمن بھی اعتراف کریں۔

محمد بن قاسم رح چند سالوں کے لئے آئے تھے لیکن سندھ سے کشمیر تک اپنے اثرات چھوڑ گئے۔

مغربی پنجاب میں بھی مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن عجیب بات ہے کہ دہلی اور آگرہ میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ جہاں مسلمانوں کی چھ سو سال حکومت رہی۔ اکثر مسلمان حکمران اسلامی نصب العین کو بھول کر شراب کباب میں مست رہتے تھے۔

اس تاریخی حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں میں جب تک جفاکشی کا جذبہ موجود رہا، سادہ زندگی کے خوگر رہے اور پھر سب سے بڑھکر یہ کہ تلوار سے ان کو پیار رہا، ان کی شان فاتحانہ رہی۔ مگر جب گانا بجانا اور شراب کباب کا دور شروع ہوا تو پھر یہ صفات چونکہ فاتح قوم کی نہیں مفتوحین کی ہوتی ہیں اسلئے پھر غیروں نے ان کو فتح کرلیا۔

علامہ اقبال رح نے اسی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے: ؎

آ تجھ کو بتاؤں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

سید جمال الدین افغانی مصریوں کے استاذ اور مشہور محقق ہیں۔ بے مثل دل و دماغ کے مالک تھے۔ کسی نے اُن سے پُوچھا کہ آپ میں تمام اوصاف موجود ہیں مگر خوش خطی نہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟
جواباً فرمایا کہ میں جس قوم کا فرد ہوں اس کی انگلیاں تلوار کے لئے بنی ہیں قلم و کتابت کے لئے نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی دائرہ کی توسیع کے لئے جس انداز میں محمد بن قاسم نے سندھ میں کام کیا تھا اگر بعد والے لوگ کرتے تو آج متحدہ ہندوستان پر بلاشرکت غیر مسلمانوں کی حکومت ہوتی تو پھر ملک کو تقسیم کرنے کی ضرورت بھی نہ رہتی جو وہ کر گئے وہ ہم نے بھگت لیا۔ سوال یہ ہے کہ آج بھی ہم مسلمان سوئے ہوئے ہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ تاریخ سے ہم عبرت حاصل کرتے لیکن یہ کیا ہوا؟ ہم آزادی کے بعد اور زیادہ بگڑ گئے، اپنے ملک کو دولخت کرا بیٹھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت زار پر ہم ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ کیا ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے اس سے بھی سخت طمانچہ کی ضرورت ہے؟

فاعتبروا یا اولی الابصار

اللّٰھمّ وفقنا لما تحبّ و ترضٰی واجعل اٰخرتنا خیرًا من الاولٰی۔ آمین یا ربّ العالمین۔

(۷)

تَفسِیرُ الفَاتِحَۃِ مِنْ جِھَۃِ ضَرُورَۃِ القُرآن

سُورۃ فاتحہ کی تفسیر اس حیثیت سے کہ قرآن پاک انسانیت کی ایک ضرورت ہے

ضرورۃ القرآن کے عنوان سے سورۃ فاتحہ میں علمی ذخیرہ کی تفصیلات ، عقلی و نقلی دلائل کا بیان اور اسمیں ہمارے لئے کیا سبق ہے ؟ اس بات کا بیان ہے۔

سُورۃ فاتحہ میں سب سے پہلا جملہ ہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہ" یعنی حقیقی تعریفیں اللہ ہی کے لئے مخصوص ہیں۔

بقول حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ قرآن پاک ایک عالمگیر کتاب ہے۔ جس میں عام فہم اور مُسلّمہ دلائل ہوتے ہیں۔

الحمد للہ | حمد کے لئے کمالات کا علم ضروری ہے

سے یہ مضمون نکلتا ہے کہ اللہ تعالےٰ محمود ہے۔ محمودیت باری عز اسمہٗ مُسلم بین الاقوام والملل ہے۔ جب اللہ تعالیٰ محمود ہے تو کائنات اسکی حامد ہے۔ لیکن حمد کے لئے علم بالکمالات ضروری امر ہے۔ کہ محمود کے کمالات کا پتہ ہو تاکہ ہم اسکی تعریف صحیح طور

پر کرسکیں۔ کمالات کے علم کے بغیر صحیح تعریف ممکن نہیں ہوتی۔ اگر ہم صرف ذہن وفکر سے اللہ تعالیٰ کی تعریف کریں مثلاً کوئی اللہ کی یوں تعریف کرے کہ یا اللہ تیرے گال سُرخ ہیں اور ناک موزوں ہے تو یہ تعریف کے بجائے مذمت کے زمرے کی چیز ہوگی۔

متحدہ ہندوستان کا ایک واقعہ ہے کہ ایک دفعہ وائسرے ہند شکار کے لیے جنگل میں شکار کے پیچھے بھاگتے ہوئے راستہ بھول گیا۔ ایک بوڑھی عورت سامنے آئی، وائسرائے کے پوچھنے پر اس نے صحیح راستہ کی طرف راہنمائی کردی، وائسرائے نے خوش ہوکر بیس روپے انعام دیا۔ بڑھیا نے دُعا دیتے ہوئے کہا کہ اللہ تجھے تھانیدار بنائے۔ بڑھیا کو علم نہ تھا کہ وائسرائے جو اپنے اختیار سے پولیس کے سب سے بڑے افسر کو بھی مقرر کرتا ہے۔ لیکن بات وہی ہے علم بالکمالات نہ ہونے کی وجہ سے بسا اوقات آدمی تعریف کے بجائے تنقیص بھی کرسکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جب ہم اپنی جنس اور کسی مخصوص شخصیت کے کمالات اور صفات جانے بغیر اسکی تعریف صحیح طور پر نہیں کرسکتے تو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات کی تعریف اسکے کمالات اور صفات کو جانے بغیر کیسے ممکن ہے؟ اسلئے حمد و تعریف کے لئے علم بالکمالات ایک ضروری امر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کمالات کا علم خود اسکے بتائے بغیر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ قرآن پاک جو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور حضرت خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے اسکے ذریعہ کمالات خداوندی کا علم ہمیں حاصل ہوا چنانچہ اس بنیاد پر ہم اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتے ہیں تو سورۃ فاتحہ کے پہلے جملہ الحمد للہ سے قرآن پاک کی ضرورت معلوم ہوئی۔

رُوحانی تربیت جسمانی تربیت سے اہم ہے

سورۃ فاتحہ کے دُوسرے جُملے "رَبِّ الْعٰلَمِين" سے بھی ضرورۃ القرآن کا پتہ چلتا ہے تفصیل یُوں ہے کہ جس طرح باری تعالیٰ کی محمودیت پر اقوام کا اتفاق ہے اسی طرح ربوبیت عامہ ہے۔ چنانچہ ربوبیتِ عامہ کے تحت اللہ تعالیٰ نے اجسام کی تربیت کا اتنے وسیع پیمانے پر انتظام کیا ہے کہ عالم علوی وسفلی کا ذرہ ذرہ تربیت الاجساد میں مصروف ہے، اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جسم انسان کے ایک حصّہ کا نام ہے دوسرا اہم حصہ روح ہے۔ اس پُورے جہان میں ہم رُوح کی تربیت کے لئے کوئی چیز نہیں پاتے۔ جبکہ جسمانی تربیت کے لئے زمین، پانی، نباتات ہوا سُورج چاند سبھی مصروف ہیں۔ اب اگر انسان کے دُوسرے اہم حِصّے یعنی رُوح کی تربیت کا کوئی انتظام نہ ہو تو یہ صورت حکمتِ خداوندی کے خلاف ہوگی کہ انسان کے کم تر حِصّے کے لئے تربیت کا انتظام اتنے اعلیٰ پیمانے پر ہو اور بہتر حصّہ کی تربیت کا انتظام نہ ہو۔

یہ بات بھی ظاہر ہے کہ روح ایک لطیف چیز ہے اور عالم بالا کی چیز ہے۔ تو اسکی غذا بھی عالمِ بالا سے آئی ہے۔ رُوح کی غذا کلام اللہ اور وحی ہے جسکو عالمِ بالا سے نازل کیا گیا ہے تو سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کو ربّ العالمین فرمایا گیا ہے ربّ الاجساد یا ربّ الاجسام نہیں فرمایا گیا۔ اسلئے جسمانی تربیت کے ساتھ کلام خداوندی کو نازل فرما کر روحانی تربیت کا انتظام بھی فرمایا گیا جس سے قرآن پاک کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔

رُوح عالمِ امر سے آئی ہے

قرآن پاک میں کافروں کے اس سوال

کے جواب میں کہ رُوح کی حقیقت کیا ہے؟

ارشادِ خداوندی ہے:

وَیَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔ (بنی اسرائیل)	اور آپ سے یہ لوگ رُوح کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ رُوح میرے ربّ کے حکم سے ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

جہانوں کی ایک قسم عالمِ خلق ہے جس کا رقبہ عرش سے فرش تک ہے اور ایک عالمِ اَمر ہے جس کا رقبہ عرش سے آگے ہے تو سوال کرنے والوں سے یہ فرمایا گیا ہے کہ روح عالمِ خلق کی چیز نہیں جس کو تم سمجھ سکو بلکہ یہ عالمِ اَمر کی چیز ہے جس کا پورا پورا ادراک نہیں کر سکتے۔ تو اس صُورت میں "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" سے مراد عالمِ اَمر ہوگا۔

قرآنی تعلیم کی ضرورت

سُورۃ فاتحہ میں قرآن پاک کی ضرورت "الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" میں بیان فرمائی گئی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت کا ذکر ہے کہ دنیوی و اخروی نعمتیں سبھی اللہ کی ذات سے وابستہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات جس طرح عظیم ہے اسکی رحمت بھی اسی طرح عظیم ہے۔

ایک حدیث میں ایک عورت کا واقعہ ہے کہ وہ قیدیوں میں آئی تھی اور اس کا بچہ گم ہو گیا تھا وہ اپنے بچے کے فراق میں بہت پریشان تھی۔ اسکی حالت یہ تھی کہ جس بچے کو دیکھتی اُسے اپنے سینے سے لگا لیتی۔ ماں کی اس بےچینی

کو دیکھ کر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم نے اللہ تعالیٰ کی شفقت و رحمت کو سمجھاتے ہوئے فرمایا:

" اَللّٰهُ اَرْحَمُ بِعِبَادِهٖ مِنْ اُمٍّ بِوَلَدِهَا "

" یعنی اللہ تعالےٰ اپنے بندوں پر اس سے بھی زیادہ مہربان ہے جس قدر ایک ماں اپنے بچے پر مہربان ہوتی ہے۔"

مادری شفقت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ بچوں کو فائدہ حاصل کرنے کی ترغیب دے اور نقصان کے کاموں سے روکے، تو پھر رحمتِ خداوندی کا یقیناً یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو صرف دنیاوی نفع و نقصان دونوں کی تعلیم دے۔ اللہ جیسی رحیم ذات کے متعلق کیسے گمان کیا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو صرف دنیاوی نفع و نقصان کی تعلیم دی ہوگی اور اخروی نفع و نقصان کی تعلیم پر توجہ نہیں دی ہوگی؟ یقیناً اللہ تعالےٰ نے دنیا اور آخرت کے منافع اور نقصانات کی تعلیم دی ہے اور اسی تعلیم کا نام کلام اللہ اور قرآن پاک ہے۔ جس سے قرآنی ضرورت ثابت ہوئی۔

مجازاتِ اعمال کے عقیدے سے قرآن کی ضرورت

سورۃ فاتحہ کی تیسری آیت مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے ضرورتِ قرآن کا ثبوت ملتا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ انصاف کے دن کا مالک ہے یعنی وہ ایک دن نیکوکاروں اور بدکاروں میں ضرور انصاف فرمائیگا اس دن کا نام یوم الدین ہے۔ اللہ تعالےٰ کی نگاہ میں مجرم اور مطیع میں فرق ہے اسی کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ۔ کیا ہم فرمانبرداروں کو گنہگاروں کے برابر کردیں گے؟ نہیں کیا ہوگیا ہے کیسے فیصلہ کرتے ہو؟

مجازات اعمال کا عقیدہ نہ ہو یہ اندھیر نگری ہوگی کہ نہ تو مجرم کو سزا ملے اور نہ ہی فرمانبردار کو جزا ملے اسی لئے قیامت کے دن کو سورۂ فاتحہ میں انصاف کا دن قرار دیا گیا ہے خوب کہا گیا ہے ! ازمکافات عمل غافل مشو؛ گندم از گندم بروید جو ز جو

مجازات اعمال کے لئے علم بالأعمال ضروری امر ہے ۔ یعنی یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اعمال کون سے ہیں جن کے نتیجے میں قیامت کو عذاب ہوگا۔ اور وہ اعمال کون سے ہیں جن کے نتیجہ میں اجر و ثواب عطا کیا جائے گا۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ اول الذکر سے اجتناب کیا جاسکے اور دوسری قسم کے اعمال پر عمل ہو سکے۔ اسی لئے ارشاد ہے :

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ — کہ ہم رسولوں کو خوشخبری سنانے
اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۔ — والے اور ڈر سنانے والے بنا کر بھیجتے ہیں۔

یہ البشار اعمال ثواب کے لئے ہے جبکہ انذار ان اعمال کے لئے ہے جن کے ارتکاب سے عذاب کا خطرہ ہے ان اعمال کی تفصیلات قرآن بتاتا ہے جس سے قرآن کریم کی ضرورت معلوم ہوئی۔

امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن میں جہاں کہیں علم و تفقہ پر زور دیا گیا ہے وہاں علم آخرت اور معرفت خداوندی مراد ہے۔ مثلاً قرآنی آیت لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ : تاکہ سمجھ حاصل کریں وہ دین میں۔ اس سے اصطلاحی فقہ مراد نہیں کہ ہدایہ وغیرہ پڑھکر آج کل کا مولوی بن جائے۔ بلکہ آخرت کا علم مراد ہے جس سے فکر آخرت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ فنون جو آج کل پڑھے جاتے ہیں اگر علوم خادمۃ للقرآن والحدیث کے طور پر پڑھے جائیں تو کوئی حرج نہیں بلکہ کتب فقہ اور دیگر فنون کا پڑھنا

اسلئے ضروری ہے کہ اس سے قرآن و حدیث کی سمجھ حاصل ہو۔ اور پھر قرآن و حدیث پر عمل کیا جائے۔ اور اگر ان علوم آلیہ و خادمہ کی تحصیل کو اصل مقصد بنا لیا جائے اور قرآن و حدیث ثانوی درجہ میں ہو جائیں تو یہ صورت قابل مذمت ہوگی۔ حضرت فاروقِ اعظم کی وفات پر حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا تھا۔ رُفِعَ تِسْعَۃ اعشار من العلم : کہ نو حصّے علم اٹھا لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس علم سے مراد آخرت کا علم ہے۔ جس کے نو حصّے یعنی نوے فی صد حضرت فاروقِ اعظم کی وفات پر اٹھا لیے گئے یہ علم کی وہ باطنی کیفیت تھی جس کا تعلق علم باللہ اور علم بالآخرت سے ہے نہ کہ آج کل عربی علم جس کے بعد عمل کی پرواہ نہیں کیجاتی۔

علوم کی یہ کیفیتِ باطنی امام غزالی رحؒ اور دُوسرے بزرگانِ دین کی کُتُب پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ امام غزالی رح کے متعلق منقول ہے کہ ان کی کتاب احیاء علوم الدّین کیمتعلق اسکندریہ کے ایک قاضی صاحب نے بتایا کہ خواب میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضرت امام غزالی رحؒ بھی وہیں موجود تھے۔ انہوں نے میری شکایت کرتے ہوئے حضور علیہ السّلام سے عرض کیا کہ احیاء العلوم صحیح ہے یا غلط ہے؟ جواباً آپ نے فرمایا کہ صحیح ہے۔ جس پر قاضی صاحب کو حد لگائی گئی۔ صبح اٹھے تو جسم زخموں سے چور تھا۔ (سبحان اللہ)

اللہ تعالےٰ کی مرضیات کے علم کے لئے ضُرورۃ القرآن

سورۃ فاتحہ میں ایک جُملہ ہے اِیَّاكَ نَعْبُدُ کہ اے اللہ ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کی معبودیت پہ تمام اقوام و ملل کا اتفاق ہے۔ اور

عبادت اطاعت کا نام ہے۔ جبکہ اطاعت کے لئے علم بالمرضیات اور نامرضیات کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت تب ہو سکتی ہے جب بندوں کو یہ معلوم ہو کہ وہ کن باتوں سے راضی ہے جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور کن باتوں سے ناراض ہے جن سے اجتناب کا حکم ہے۔ الغرض مرضیاتِ خداوندی اور نامرضیات خداوندی کا علم بھی بجز کلام ربّانی محال ہے۔ اس سے بھی قرآن پاک کی ضرورت ثابت ہوئی۔

امدادِ خداوندی کے علم کے لئے ضرورۃ قرآن

سورۃ فاتحہ کے جملہ "اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ" یعنی اللہ تعالیٰ ہم صرف آپ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے استعانت یہ بھی ایک اجماعی مسئلہ ہے۔ اور یہ استعانت چونکہ تحصیل مقاصد کے لئے ہوتی ہے۔ جس کے لئے ضروری ہے کہ نافع مقاصد اور مضر مقاصد کا علم ہو اور یہ علم بھی اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کے نفع اور نقصان سے آگاہ کرنے کے لئے اپنی کتاب قرآن مجید اپنے نبی آخر الزمان پر نازل فرمائی جس سے ضرورۃ قرآن ثابت ہوئی۔ اس لئے کہ امداد خداوندی کے حصول کا علم کلام خداوندی سے ہی ہو سکتا ہے۔

سورت فاتحہ میں | **صراطِ مستقیم کا علم بھی اللہ کے بتانے پر موقوف ہے**

اھدنا الصراط المستقیم الخ یہاں ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ ہم صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کریں۔ اور وہ صراطِ مستقیم انعام یافتہ لوگوں کی راہ ہے جبکہ مغضوبین اور ضالین کی راہ سے بچانے کی دعا تلقین فرمائی گئی ہے۔ اس مسئلہ پر بھی اقوام و ملل کا اتفاق ہے کہ انعام یافتہ طبقہ قابلِ تقلید رہے۔ جبکہ مغضوبین اور ضالین قابل اتباع نہیں ہوتے۔ انعام کے حسن اور غضب و ضلالت کے قبح پر سب کا اتفاق ہے ہاں اگر اختلاف ہے تو صرف اسکی تعیین میں۔

اب یہ بات قابلِ غور ہے کہ وہ اعمال کون سے ہیں جو انعام کا سبب بنتے ہیں؟ اور وہ اعمال کون سے ہیں جو غضب و ضلال کا سبب بنتے ہیں۔ یہ علم صرف عقل سے ناممکن ہے۔ بلکہ اسکی وضاحت کلام ربانی سے ہوگی۔ اور قرآن پاک نے انعام والے اعمال اور غضب و گمراہی کیطرف لے جانے والے اعمال کا تفصیلاً بیان فرمایا ہے۔ اس سے قرآن پاک کی ضرورت ثابت ہوئی۔

٨

تَفسِیرُ الفَاتِحَۃِ مِن حَیثُ کَونِھَا
جَامِعَۃً لِلعُلُومِ الاِسلَامِیَّۃِ

سورۃ فاتحہ کی تفسیر اس حیثیت سے کہ یہ اسلامی علوم کی جامع ہے

سورۃ فاتحہ چونکہ خلاصہ ہے سارے دین کا اسنے علوم اسلامیہ کے اصول اسمیں جمع کر دیئے گئے ہیں اور اسمیں کوئی اشکال نہیں ہے اسلامی علوم پرنگاہ ڈالنے سے اسکے جو کلیات معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔

نمبر۱ : الٰہیات : جن میں ذات و صفات و افعال باری تعالےٰ سب شامل ہیں۔ الٰہیات کے ان عنوانات کا ماخذ سورہ فاتحہ کی پہلی دو آیات الحمد سے رحیم تک ہیں۔

نمبر۲ : معاد : یعنی مرنے کے بعد جو احوال پیش آنے والے ہیں اور آخرت کے متعلق جتنے بھی عقائد ہیں۔ کہ نیکی اور بدی کا بدلہ ضرور ملے گا۔ ان عقائد کا ذکر آیت نمبر۳ مالك يوم الدين میں اجمالی طور پر موجود ہے۔

نمبر۳: تصرّفات تشریعیّہ: جس کا مطلب ہے کہ انسانی زندگی کے لئے شرعی قوانین وضع کرنا یعنی حلال و حرام، ثواب عذاب، فرض واجب سُنت مُباح وغیرہ یہ عنوانات علمِ فقہ میں بیان کئے جاتے ہیں۔ سُورۃ فاتحہ کی آیت ۴ کے پہلے جُملے ایاك نعبد میں ان علوم کی طرف اشارہ ہے۔ ان میں اصولی احکام اور فروعی احکام بھی شامل ہیں۔ چنانچہ احکام القرآن پر جو کتابیں علماءِ اسلام نے لکھی ہیں ان میں اسی موضوع کو بیان کیا گیا ہے۔

جیساکہ امام جصاصؒ حنفی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں بیان کیا ہے۔

نمبر۴: تصرّفاتِ کونیّہ: یعنی اس کائنات اور جہان میں جو تصرفات ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی کے لئے صحت یا مرض قحط یا خوشحالی کے جو فیصلے تکوینیات کے تحت ہوتے ہیں۔ سورۃ فاتحہ میں "ایّاك نستعین" میں ان موضوعات کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

نمبر۵: سُورۃ فاتحہ میں اھدنا سے آخر تک انبیاء، صدیقینؓ شہداء اور صالحین کو انسانوں کے لئے اُسوۂ حسنہ اور مشعلِ راہ بتایا گیا ہے۔ دُوسرے لفظوں میں انعام یافتہ طبقات کی اتباع اور مغضوبین وضالین کے طریق سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے۔ "سُورۃ فاتحہ علوم اسلامیہ کی جامع ہے۔"

اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علوم کا خاصہ تہذیب النفس ہے، یعنی رُوحِ انسانی کو مہذّب بنانا اسی طرح کفر اور دیگر گناہوں سے رُوح کو پاک صاف رکھنا بھی تہذیب النفس کہلاتا ہے۔ تہذیب النفس کے لئے پہلا علم علم الاعتقادات ہے،

دوسرا علم الاخلاق ہے تیسرا علم العبادات ہے چوتھا علم المعاملات ہے۔ معاملات سے مراد یہاں عام ہے والدین اور بیوی بچوں کے حقوق اور فقہی کتابوں میں کتاب البیوع کے بعد تمام ابواب اسمیں شامل ہیں۔ پانچواں علم التعزیرات ہے کہ مجرم کو کس طرح سزا دی جائے اور یہ کہ کس جرم کی کیا سزا ہے؟ یہ سب علوم اجمالاً سورۂ فاتحہ میں موجود ہیں۔

مثال کے طور پر بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝ الحمد للہ رب العالمین ۝ ان جملوں میں اعتقادات کو بیان کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نام ہے اس ذات کا جو تمام صفاتِ کمالیہ کا جامع ہے تو بسم اللہ الرحمن الرحیم میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ ثبوتیہ کا بیان ہوا جبکہ الحمد للہ میں صفاتِ سلبیہ کو بیان فرمایا گیا ہے۔ اسلئے کہ اللہ تعالیٰ محمود ہے اور محمود وہ ہوتا ہے جسمیں کوئی عیب نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ کے لئے بیوی بچوں کا ہونا اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی کا محتاج ہونا عیب ہے۔ رب العالمین میں علم الاخلاق کا بیان ہے اسلئے کہ اس جملے میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیتِ عامہ کو بیان کیا گیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے جس طرح اجسام کی تربیت کا انتظام فرمایا ہے اسی طرح ارواح کی تربیت کا انتظام بھی فرمایا ہے اور روح کی تربیت کا نام علم الاخلاق ہے۔

سورۂ فاتحہ میں "الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ" کو دوبارہ لایا گیا ہے اسمیں اخلاق کا بنیادی مسئلہ شفقت علی الخلق کا بیان ہے کہ مخلوقات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا رویہ مشفقانہ ہے۔ مالک یوم الدین ۝ میں علم التعزیرات کی طرف اشارہ ہے کہ جب انصاف کے دن جزا وسزا ملے گی تو اس کا ایک نمونہ دنیا

میں بھی ہونا چاہیئے۔

اِیَّاكَ نَعْبُدُ : میں عبادات کو بیان کیا گیا ہے جبکہ وایّاكَ نَسْتَعِیْن : میں تمام معاملات کا بیان آ گیا ہے کیونکہ تمام کاروبار باہمی تعاون پر مبنی ہے بغیر تعاون کے معاملات کی تکمیل نہیں ہو سکتی مثلاً مالک و مزارع میں آجر و اجیر میں اسی طرح تمام معاملات میں تعاون ضروری ہے ۔ اھدنا الصّراط المستقیم ٥ سے آخر تک میں اخلاق کی ایک اور بنیادی چیز کا بیان ہے کہ ہدایت کا حصول بھی ضروری چیز ہے اور ضلالت سے اجتناب بھی ضروری ہے۔

اس آیت میں انعام یافتہ اور مغضوبین کا تذکرہ کر کے قیامت اور معاد کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ وہاں مظہر انعام جنت ہے جبکہ مظہر غضب دوزخ ہے۔

بحمدہٖ تعالٰی سُورۂ فاتحہ کی تفاسیر ختم ہوئیں

حل الشبہات الواردۃ علی الفاتحۃ

سورۃ فاتحہ پر کئے جانیوالے اعتراضات اور انکے جوابات

سورۃ فاتحہ پر مخالفینِ اسلام کی طرف سے جو اعتراضات کئے گئے ہیں
رۃ فاتحہ کی تفاسیر کے اختتام پر حضرت الاستاذ مولانا علامہ شمس الحق افغانی رحمہ اللہ تعالیٰ
ز ان اعتراضات کا تذکرہ فرمایا تھا یہ اعتراضات تعداد میں گیارہ ہیں۔ حضرت
افغانی رح نے دوران سبق ان کے مفصل جوابات بیان فرمائے تھے اور اس کا

عنوان بھی حضرت ہی کا بیان کردہ ہے۔ (مرتب)

① اَلشُّبْهَةُ الأُولٰى:

پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے سورۃ فاتحہ کے طرزِ کلام سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ کلامِ الٰہی نہیں ہے کیوں کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں دیکھا جائے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے، تو جب اس کلام کا متکلم خود باری تعالیٰ ہے کیا وہ کسی اور خدا کے متعلق فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں؟ اور پھر اللہ تعالیٰ کی تعریف اور اس کا مربّی اور رحمٰن ورحیم ہونا اور اسکی عبادت کا اقرار اور اس سے استعانت طلب کرنا اور اسکی تعریف کرنا۔ کیا یہ کسی اور خدا کی تعریف ہو رہی ہے؟ خلاصہ یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ کے یہ جملے بتا رہے ہیں کہ یہ کلامِ الٰہی نہیں ہے؟

الجواب

پہلا جواب یہ ہے کہ کلام کا یہ انداز اور اسلوب صرف قرآن کریم ہی کی تخصیص نہیں بلکہ ہر بلیغ کلام میں یہ ہوتا ہے کہ کبھی متکلم کی زبان سے حکایت ہوتی ہے اور کبھی غیر متکلم کی زبان سے مضمون بیان ہوتا ہے۔

یہاں دوسری صورت ہے کہ سورۃ فاتحہ کلام تو اللہ تعالیٰ کا ہے مگر اس کا مضمون بندے کی طرف سے ہے۔ جسکی تعلیم اللہ تعالیٰ نے ہی دی ہے کہ بندے یوں کہا کریں کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو جہانوں کا پالنے والا ہے اور رحمٰن ورحیم ہے الخ خلاصہ یہ ہے کہ متکلم تو اللہ تعالیٰ ہے لیکن

یہ حکایت اور مضمون بندے کیطرف منسوب ہے اسلئے یہ شبہ درست نہیں کہ سورۃ فاتحہ کلام الٰہی نہیں بلکہ کسی اور کا کلام ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ بات تو اہل علم جانتے ہیں کہ قرآن کریم کی ترتیب نزولی اور موجودہ ترتیب ایک نہیں موجودہ ترتیب جو ترتیب رسولی ہے سورۃ فاتحہ تمام میں پہلی سورت ہے لیکن نزولی ترتیب میں صحیح روایات کے مطابق سب سے پہلے سورۃ علق کی ابتدائی پانچ آیات نازل ہوئیں ہیں۔ جنکی ابتداء اقرأ سے ہوئی یعنی پڑھ اپنے رب کے نام سے، جب ابتدائی نازل ہونے والی وحی میں پڑھنے کا حکم آگیا تو اب سارا قرآن پاک، سورۃ فاتحہ سمیت اقرأ کے تحت داخل ہے۔ بار بار اقرأ کو لوٹانا کوئی ضروری نہیں۔ اسکی مثال یہ ہے کہ جیسے استاد شاگرد سے ایک بار کہتا ہے پڑھو جب شاگرد نے پڑھنا شروع کر دیا اور پھر سانس لیتے ہوئے وقف کیا تو اب پھر استاد شاگرد کو نہیں کہتا کہ پڑھو پڑھو بلکہ سبق شروع کرتے وقت ایک بار پڑھنے کا حکم کرنا کافی سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح جب نزول قرآن کے شروع میں ایک بار اقرأ کہہ دیا یعنی پڑھئے تو اب سورۃ فاتحہ بھی اسی کے تحت ہے اسلئے اب یہ شبہ جاتا رہا کہ سورۃ فاتحہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اپنے دربار میں درخواست کرنے کے لئے سورۃ فاتحہ کی تعلیم فرمائی ہے اور تعلیم خداوندی کے مطابق بندے اس درخواست کو پیش کرتے ہیں۔ اسی لئے سورۃ الفاتحہ کا ایک نام سورۃ التعلیم بھی ہے۔

② الشبهة الثانية : دوسرا اعتراض اور

شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ سورۃ فاتحہ میں سب سے پہلا جملہ الحمد للہ ہے یعنی تمام تعریفیں

اللہ کیلئے خاص ہیں۔ مفسرین اور علماء بلاغت کی رائے یہ ہے کہ جنس تعریف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور حمد کا کوئی فرد اللہ کے سوا کسی کے لئے ثابت نہیں اور یا پھر الحمد پر لام استغراقی ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب جنس حمد یا کل تعریفیں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کیلئے نہیں ہونی چاہئیں۔ جبکہ یہ مضمون خلاف واقع ہے۔ کیونکہ بشر کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔ مثلاً سماویات میں سورج، چاند اور ستاروں کی تعریف ہوتی ہے اسی طرح ارضیات میں نباتات، جمادات، حیوانات اور پھر انسانوں کی تعریف ہوتی ہے لہٰذا یہ اختصاص اللہ تعالیٰ کیلئے نہ رہا؟

الجواب اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جس کی بھی تعریف ہوتی ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تعریف ہی ہے۔ کیونکہ تعریف محمود کے کمالات پر کی جاتی ہے اور ممکنات کے تمام کمالات حقیقت میں عطیۂ خداوندی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر مخلوق میں سے کسی کے علم، تقویٰ، زہد، حسن، سمجھ اور دولت کی بنیاد پر تعریف ہوتی ہے تو یہ تمام کمالات اور افعال اللہ تعالیٰ کے ہیں کہ اصل خالق وہی ہے۔ اسلئے مخلوق کی تعریف میں خالق کی تعریف ہوتی ہے اسکی ایک مثال یہ ہے کہ کسی مشہور کاتب کا کوئی جملہ لکھا ہوا دیکھا جائے تو اس جملے کے حسن خط کی تعریف درحقیقت اصل کاتب کی تعریف ہے جبکہ تعریف کرنے والا کاغذ پر لکھے ہوئے قطعہ کی تعریف کر رہا ہے۔ اسی طرح یوں سمجھنا چاہئیے کہ اس دنیا میں مخلوق کے تمام کمالات نقوش کی طرح ہیں۔ اور خالق و فاعل ہونے کی حیثیت سے ان نقوش کا نقاش اللہ تعالیٰ ہے۔ اسلئے نقش کی تعریف درحقیقت نقاش

کی تعریف ہوتی ہے۔ لہٰذا عدمِ اختصاص پر جو شبہ کیا گیا وہ غلط ہے اور یہ کہ
سب کی تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ یہ مضمون بالکل مطابق واقع ہے۔

اَلشُّبْهَةُ الثَّالِثَةُ

تیسرا اعتراض

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پر ہے کہ عربی زبان کے قواعد کے مطابق لفظ رحمٰن کا
وزن فعلان ہے اور لفظ رحیم کا وزن فعیل ہے۔ پہلے لفظ
یعنی رحمٰن میں پانچ حروف ہیں جبکہ رحیم میں چار حروف ہیں اور
قانون یہ ہے کہ کسی لفظ میں حروف کی زیادتی معانی کے زائد ہونے پر دلالت
کرتی ہے۔ اس لحاظ سے لفظ رحمٰن میں رحمت زیادہ ہوگی بہ نسبت لفظ رحیم کے
اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ لفظ رحمٰن میں رحیم کی نسبت مبالغہ زیادہ ہے۔
اور کلام میں طریقہ یہ ہے کہ ترقی من الادنیٰ الی الاعلیٰ ہوا کرتی ہے۔ اس
لحاظ سے لفظ رحیم لفظ رحمٰن سے پہلے آنا چاہیئے تھا۔ جبکہ سورۃ فاتحہ میں اس
کا عکس ہے۔

جواب

مفسرینِ کرام نے اس شبہ کا ایک جواب یہ دیا ہے کہ
یہاں رعایت فواصل مقصود ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ کی پہلی آیت
کے آخر العٰلمین میں یاء ساکن ماقبل مکسور ہے۔ اسلئے دوسری آیت میں
مماثلت کی بلیغانہ شان پیدا کرنے کے لئے الرحیم پر آیت کو مکمل کیا گیا
اگر اس جگہ الرحمٰن آجاتا تو رعایت فواصل والی بلاغت نہ رہتی۔

میرے نزدیک معقول جواب یہ ہے کہ بیشک لفظِ رحمٰن میں لفظ رحیم سے مبالغہ زیادہ ہے لیکن ابلغیت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ابلغیت من حیث الکم (مقدار کے اعتبار سے مبالغہ) اور دوسری ابلغیت من حیث الکیف (قدر و قیمت کے اعتبار سے مبالغہ)۔ اگر یہاں کمیت کی ابلغیت مراد ہو تو چونکہ رحمٰن دنیا کی رحمتوں کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کمیت اور تعداد کے لحاظ سے دنیا میں رحمتِ خداوندی زیادہ عام ہے اسلئے کہ کافر و مومن دونوں ہی دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اسلئے کمیت کے اعتبار سے لفظ رحمٰن میں مبالغہ زیادہ ہوا۔ اور رحیم چونکہ آخرت کی رحمتوں کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ جبکہ آخرت کی نعمتیں اور رحمتیں صرف مومنین کے لئے خاص ہیں۔ کافر اس میں شامل نہیں۔ اس لئے مقدار و کمیت کی عمومیت کے لحاظ سے آخرت کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے کم ہوں گی۔ خلاصہ یہ کہ کمیت کے لحاظ سے لفظ رحمٰن میں مبالغہ بے شک زیادہ ہے لیکن ترتیب وجودی کا لحاظ کرتے ہوئے لفظ رحمٰن کو مقدم لایا گیا ہے اور لفظ رحیم کو مؤخر۔ یعنی دنیا آخرت سے وجوداً مقدم ہے۔ اسلئے اللہ تعالیٰ کی وہ صفت جس کا تعلق دنیا سے ہے، اسے مقدم لایا گیا ہے۔ اور جس صفت کا تعلق آخرت سے ہے اُسے مؤخر لایا گیا ہے۔ اور یہ کارروائی اسلئے ہوئی تاکہ عنوان اور معنون میں مطابقت ہو جائے۔

اگر کیفیت کے اعتبار سے ابلغیت مراد ہو تو اس حقیقت میں کیا شک ہے کہ دُنیا کی نعمتیں قدر و منزلت کے لحاظ سے آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں نہایت حقیر و ادنیٰ ہیں جبکہ آخرت کی نعمتیں عظیم، اعلیٰ اور دائمی ہیں۔ اسلئے ابلغیت یعنی معنًی زیادہ مُبالغہ لفظ رحیم میں ہے نہ کہ لفظ رحمٰن میں۔ لہٰذا یہ ترقی من الأدنیٰ الی الأعلیٰ کے ضابطہ کے مطابق ہوا نہ کہ خلاف۔ اس لئے اس ضابطہ کی خلاف ورزی والا اشکال رفع ہوگیا۔ ہاں ایک سوال اس پر یہ ہو سکتا ہے کہ آخرت کی نعمتوں کو ان کی عظمت کے باوجود کلام میں مؤخر لانے کی آخر کیا وجہ ہے؟ جبکہ کسی چیز کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے پہلے لایا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنِ پاک کا اصل مقصد یہ ہے کہ اوّلاً دُنیا کی نعمتوں کا ذکر نمونے کے طور پر کر کے آخرت کی نعمتوں کی طرف ترغیب دی جائے۔ یہ صُورت آخرت کی نعمتوں کی عظمت کے پیشِ نظر اختیار کی گئی ہے۔ اس کی ایک مثال سورۃ علق کی آیت اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ہے۔ علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ سورۃ علق میں اصل مقصد چونکہ قراءت ہے اسلئے اقرأ کو اسم ربّك پر مقدم کیا گیا۔ اسی طرح یہاں سورۃ الفاتحہ میں صفت رحمٰن جو دُنیا کی نعمتوں پر دال ہے کو مقدّم اور صفت رحیم کو مؤخر لاکر یہ واضح کیا کہ اصل مقصد آخرت کی نعمتیں ہیں جو قدر و قیمت کے لحاظ سے عظیم تر ہیں۔

④ الشُّبْهَةُ الرَّابِعَةُ

چوتھا اعتراض

یہ کیا ہے کہ رحمٰن و رحیم کو مکرر لایا گیا ہے۔ ایک مرتبہ تسمیہ میں اور پھر سورۃ فاتحہ میں

جبکہ کلام بلیغ میں تکرار نہیں ہوا کرتا؟

الجواب

اس کا جواب یہ ہے کہ تکرار وہاں مناسب نہیں ہوتا جہاں دونوں جگہ غرض ایک ہو اور اگر غرض الگ الگ ہو تو پھر تکرار میں کوئی حرج نہیں اور ایسا تکرار بلاغت کے منافی نہیں ہوتا یہاں لفظ رحمٰن ورحیم کو تسمیہ میں جولایا گیا تو اسکی غرض استجاب الفیض (طلب فیض) ہے اور فیوضات دنیوی بھی ہوتے ہیں اور اخروی بھی، دنیا کے فیوضات کیلئے رحمٰن اور آخرت کے فیوضات کیلئے لفظ رحیم لایا گیا ہے۔ تسمیہ میں لفظ رحمٰن ورحیم کو لانے کی غرض فیوضات کی طلب ہوتی۔

پھر سورۃ فاتحہ کی دوسری آیت میں الرحمن الرحیم کو اس غرض سے لایا گیا ہے کہ الحمد للہ میں جو دعوٰی کیا گیا تھا کہ سب تعریفیں اللہ تعالٰی کے لئے ثابت ہیں۔ یہاں اس دعوٰی کی دوسری دلیل کو بیان کیا گیا ہے یعنی اللہ تعالٰی کے محمود ہونے پر پہلی دلیل رب العالمین ہے۔

دوسری دلیل الرحمن الرحیم ہے اور تیسری دلیل "مالک یوم الدین" ہے۔ خلاصہ یہ کہ تسمیہ اور سورۃ فاتحہ میں الرحمن الرحیم کا تکرار بلاغت کے منافی اسلئے نہیں کہ دونوں جگہ غرض ایک نہیں بلکہ مختلف اغراض کے لئے ان الفاظ کو مکرر لایا گیا ہے۔

۵ الشبهة الخامسة

پانچواں اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ آیت مالک یوم الدین میں یہ بتایا

گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ روزِ جزا کے مالک ہیں جبکہ قرآن پاک ہی میں ایک جگہ ارشاد

خداوندی ہے :

"فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُولٰى " یعنی دنیا و آخرت دونوں ہی کا مالک اللہ تعالیٰ

کی ذات ہے تو جب دنیا کا مالک بھی وہی ہے تو آخر اسکی کیا خصوصیت

ہے کہ یہاں سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کو آخرت کا مالک بتایا گیا ہے۔

اَلْجَوَابُ اس کا جواب یہ ہے کہ مالکِ حقیقی تو دنیا و آخرت دونوں

میں اللہ رب العالمین کی ذات ہی ہے لیکن دنیا میں مجازی مالک اور

بھی ہیں۔ اور انکو اختیارات بھی دیئے گئے ہیں۔ مثلاً ایک حاکم کو اپنی رعیت پر

کچھ اختیارات حاصل ہیں اور ایک انسان کو بطور مالک اپنی مملوکات پر اختیارات

ہیں لیکن قیامت کے دن یہ مجازی ملکیتیں اور اختیارات سب ختم ہو جائیں

گی۔ قرآنِ پاک نے بتایا ہے کہ قیامت میں یہ آواز آئے گی لِمَنِ

الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؟ آج کس کی حکومت ہے ؟ روایات کے مطابق

ایک عرصہ گزر جائیگا کسی طرف سے کوئی جواب نہ آئے گا۔ تو پھر اللہ تعالیٰ ہی کی

طرف سے یہ جواب دیا جائیگا:

"لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ" یعنی آج صرف اللہ ہی کی حکومت ہے جو ایک

اور غالب ہے۔

⑥ الشبهة السادسة

چھٹا اعتراض یہ کیا جاتا

ہے کہ ایاکَ نَعبُدُ وَاِیَّاکَ نَستَعِین میں نستعین ترتیب کے لحاظ سے نعبد پر مقدم ہونا چاہیئے ۔ اسلئے کہ عبادت میں امداد کی اسیطرح ضرورت ہوتی ہے جس طرح نماز کے لیئے وضو کی ضرورت ہوتی ہے ؟

اَلجَوَابُ

نمبرا : اس سوال کا ایک جواب علامہ تفتازانیؒ نے دیا ہے کہ فواصل کی رعایت مقصود ہے ۔ یعنی اس سے پہلی آیت کے اختتام پر یوم الدین آیا ہے ۔ اگر نَعبُد کو بعد میں اور نستعین کو پہلے لایا جاتا تو وہ وزن برقرار نہ رہتا ۔ رعایت فواصل کا یہی مطلب ہے ۔

نمبر۲ : دوسرا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ ایاک نعبد میں توحید تشریعی کو اور ایاک نستعین میں توحید تکوینی کو بیان فرمایا گیا ہے ، توحید تشریعی یہ ہے کہ زندگی کے لیئے قوانین واحکام مرتب کرنا ۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اس صفت میں اللہ تعالیٰ کی ذات واحد ہے ۔

چنانچہ ایک دوسری آیت میں اسے یوں بیان فرمایا گیا : "إن الحکم إلا اللہ " یعنی حکم دینا اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ خاص ہے ۔ تو سورۃ فاتحہ میں لفظ نعبد میں اسی توحید تشریعی کو بیان فرمایا گیا ہے ۔ اور تکوینی توحید کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ شرعی قوانین کا مرکز ہے ۔ اسی طرح کائناتی قوانین کا بھی وہی مرکز ہے ۔ اور اسمیں وہ اکیلا ہے ۔ چنانچہ نفع اور نقصان کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے ۔ اسکو نستعین میں بیان فرمایا گیا ہے ۔ ایک اور جگہ اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے ۔

سُبْحَانَ الَّذِی بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ "۔ پاک ہے وہ ذات جس کے قبضہ میں ہر چیز کی حکومت ہے۔

توحید تشریعی اور توحید تکوینی کی مندرجہ بالا تشریح سامنے آنے سے اس جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ چونکہ توحید تشریعی افضل ہے توحید تکوینی سے، اسی لئے عربی طرز تکلم کے مطابق افضل کو مقدم لایا گیا۔ اور توحید تشریعی کی افضلیت کی دلیل یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام توحید تشریعی کی خاطر تشریف لائے۔ چنانچہ قرآن میں جہاں بھی کسی پیغمبر کی طرف سے پیغام رسانی کا ذکر فرمایا گیا ہے وہاں پہلا پیغام جو حضرات انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی قوم کو دیا وہ قرآنی بیان کے مطابق یہ ہے۔ یَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ: اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو۔ تمہارے لئے اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان لوگوں نے عام طور پر توحید تشریعی میں شرک کیا تھا اس لئے انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد توحید تشریعی رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ توحید تکوینی کو بھی انبیاء کرام علیہم السلام نے بیان کیا ہے لیکن اس کا بیان توحید تشریعی کے لئے بطور دلیل ہوا گویا توحید تکوینی تو مسلمات میں سے ہے۔ جیسے دن روشن ہوتا ہے اور رات تاریک ہوتی ہے۔ اسی طرح توحید تکوینی کو ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ توحید تشریعی توحید تکوینی سے افضل ہے اسلئے عربی طرز تکلم کے مطابق افضل کو ہی مقدم لایا جاتا ہے۔ چونکہ نعبد میں توحید تشریعی کا بیان ہے اسلئے یہاں سورۃ فاتحہ میں اسکو پہلے لایا گیا اور نستعین میں توحید تکوینی کا ذکر ہے۔ اسلئے اسے نعبد سے مؤخر لایا گیا۔

نمبر۳: ایک اور جواب یہ ہے کہ قانون ہے کہ
"تتمۃ الشیٔ یذکر فی آخر الشیٔ" (کسی چیز کا تتمہ اسکے آخر میں ذکر کیا جاتا ہے)
مطلب یہ ہوا کہ سورۃ فاتحہ میں جب پہلے یوں کہا گیا ہے کہ اے اللہ ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں (ایاك نعبد) گویا اسمیں ایک گونہ دعوٰی ہوا کہ ہم تیری بندگی کرتے ہیں جبکہ دعوٰی بندگی کی شان کے مناسب نہیں، تو اس وہم کو ایاك نستعین سے دور کیا گیا کہ بیشک ہم آپ کی عبادت کرتے ہیں مگر سب کچھ اے اللہ آپ کی امداد و اعانت سے ہوتا ہے۔ یعنی ہم عبادت سمیت ہر کام میں آپ کی امداد کے محتاج ہیں۔ اسلئے وایاك نستعین کو بعد میں لانا ہی مناسب تھا۔

⑦ الشبهة السابعة

ساتواں اعتراض

اِھدِنا الصِّراطَ المُستَقِیم پر کیا جاتا ہے کہ اس آیت میں بارگاہ خداوندی میں ہدایت کی درخواست کی جا رہی ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ اگر قائلین فاتحہ کو ہدایت حاصل ہے تو یہ تحصیل حاصل ہوتی یعنی ایک حاصل شدہ شیٔ کو دوبارہ حاصل کرنا عبث کام ہونے کی وجہ سے غلط ہے۔ اور اگر فاتحہ پڑھنے والوں کو ہدایت حاصل نہیں تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قائلین فاتحہ ہدایت سے خالی ہیں۔

الجواب

اس سوال کا ایک جواب جو قاضی بیضاوی اور دوسرے مفسرین نے دیا ہے یہ ہے کہ ہدایت کے بہت سے مراتب ہیں۔ کیونکہ

ہدایت معرفت الٰہی پر مبنی ہے اور معرفت الٰہی کے درجات مختلف ہیں۔ کوئی درجہ ایسا نہیں جسکے اوپر درجہ نہ ہو۔ تو اب پہلی صورت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ قاری فاتحہ کو اگر ایک درجہ حاصل ہے تو وہ اھدنا میں اس سے اوپر والا درجہ اللہ تعالیٰ سے مانگ رہا ہے۔ جو اسے حاصل نہیں اسلئے تحصیل حاصل کا سوال باقی نہیں رہا۔

ہدایت کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک فاتحہ پڑھنے والا صاحب ایمان ہے جس سے آگے ہدایت کے بہت سے درجات ہیں اسکی ایک مثال یوں ہو سکتی ہے کہ ایک لاکھ پتی تاجر ہے لیکن پھر بھی وہ تجارت میں مصروف ہے۔ تو اسکو اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ تحصیل حاصل کر رہا ہے۔ اسلئے کہ وہ جسکی تحصیل کر رہا ہے وہ اسے حاصل نہیں اور جو حاصل ہے اسکی تحصیل نہیں کرتا۔ چونکہ مالداری کے درجات بہت ہیں۔ اسی طرح یہاں سورۃ فاتحہ کا پڑھنے والا جس ہدایت کا طالب ہے وہ حاصل شدہ ہدایت سے اگلا درجہ ہے۔

دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ صراطِ مستقیم سے مراد دین ہے لیکن جس طرح محسوسات میں سڑک اور راستہ مقصود نہیں ہوتا بلکہ یہ منزل مقصود تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اسی طرح روحانیات میں دین کو ایک راستہ اور سڑک سمجھا جاتا ہے جبکہ مقصود دو چیزیں ہیں۔ رضائے الٰہی اور مقام رضائے الٰہی یعنی جنت۔ تو بندہ اب فاتحہ پڑھتے وقت جب یہ کہتا ہے کہ اے اللہ مجھے منزل مقصود تک پہنچانے والا راستہ بتا جس کا مطلب یہ ہے کہ میری عبادت مقبولین والی عبادت بنا دے۔ جس کا نتیجہ جنت ہو۔ تو یہ مقبولیت سورۃ فاتحہ میں مانگی جا رہی ہے۔ جو ایک غیبی چیز ہے اور جو حاصل نہیں اور اللہ تعالیٰ کی عطاء

ہی سے مل سکتی ہے۔ صرف عمل کافی نہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث ہے کہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بغیر کوئی جنت میں نہیں جاسکتا جس پر صحابہ کرام نے عرض کیا کہ حضور آپ بھی نہیں جاسکتے ؟ آپ کا جواب احادیث میں یہ آتا ہے فرمایا :

وَلَا أَنَا اِلَّا اَن یتغمدنی اللہ برحمۃ۔ یعنی میں بھی نہیں داخل ہوسکتا ہاں جب اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ سورۃ فاتحہ میں جس ہدایت کی درخواست کی جارہی ہے وہ مقبولیت ہے جو ایک غیبی چیز ہے جس کا پتہ خود بخود ہمیں نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہی اسکے حاصل ہونے کا ہمیں علم ہے۔ لہٰذا وہ مقبولیت ایک مانگنے کی چیز ہے جو اھدنا میں مانگی جارہی ہے۔

تیسرا جواب جو علم کلام کی روشنی میں دیا گیا ہے وہ جیسا کہ امام الحرمینؒ نے کتاب الارشاد اور علامہ جرجانیؒ نے شرح مواقف میں تصریح کی ہے کہ اعراض کو بقاء نہیں ہے :۔ العرض لا یبقی فی وقتین : جس کا مطلب یہ ہے کہ جو عرض اپنے محل کے ساتھ قائم ہوتا ہے وہ ایک سیکنڈ میں تو ہوتا ہے لیکن دوسرے سیکنڈ میں گم ہوجاتا ہے۔ پھر اس کا دوسرا فرد پیدا ہو کر فوراً اسکی جگہ لے لیتا ہے۔ اور یہ ایک تسلسل ہے جو چلتا رہتا ہے اسی طرح ہدایت مہتدی (ہدایت یافتہ) کے لئے ایک عرض ہے اور ایمان مؤمن کے لئے ایک عرض ہے۔ مہتدی ہدایت کے ساتھ موصوف ہے اور مومن ایمان کے ساتھ موصوف ہے، جب تک ایک مسلمان مرتد نہ ہوجائے

تسلسل قائم رہتا ہے اور اُسکے ایک فرد کے بعد دُوسرے فرد کا آنا مشیتِ الٰہی پر موقوف ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہو کہ ایک مؤمن صاحبِ ایمان رہے اور اسکی صفت زائل نہ ہو اس کا تسلسل وجود تعاقبِ افراد سے ہوتا ہے جو یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور جاتے ہیں لیکن ہر فرد کے وجود کے لئے ارادۂ الٰہی کا تعلق ضروری ہے۔

خلاصہ یہ کہ وجوداتِ ہدایت اور وجوداتِ ایمان جو متعاقب بالعدمات ہیں کہ ایک کے آنے سے دُوسرے کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اِھدنا میں ہدایت مانگنے والا اس فرد کو مانگ رہا ہے جو معدوم ہو چکا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ طلبِ ہدایت کی ہر آن ضرورت ہے۔

متکلمین اسلام کہتے ہیں کہ ان اعراض میں استمرارِ شخصی کے بجائے استمرار نوعی ہوتا ہے۔ اور اس نوع کی ہدایت اور ایمان مہتدی اور مؤمن کے لئے پیوست نظر آتے ہیں اور پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ شریعت میں مؤمن بننے کے لئے سلسلۂ تعاقبِ افرادِ ایمان کافی ہے۔ گو درمیان میں عدمات آتے رہیں۔ مگر وہ عدمات متخللہ کالعدم ہو جاتے ہیں۔

عارفِ رُومی رح نے ایک حدیث کو سمجھانے کے لئے ایک مثال دی ہے۔ حدیث یہ ہے: الدُّنیا ساعۃ کہ دنیا ایک ساعت اور گھڑی کا نام ہے۔ بیشک تحقیقی حیثیت سے اگرچہ اعراض کا وجود متخلل اور عدمات میں منفصل ہے لیکن عرفاً اور شرعاً وہ عدمات بھی متصلات ہیں جسکی مثال یہ ہے کہ ایک شعلۂ جوّالہ ہوتا ہے کہ نیچے ایک لکڑی کے آگے کوئی کپڑا تیل میں بھگو کر اسکو آگ لگا دیتے ہیں اور پھر ہاتھ سے لکڑی کو گھماتے ہیں۔ تو اس وقت

سُرخ رنگ کا ایک دائرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دائرہ میں عَدمات پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر تیزی کی وَجہ سے وہ عدمات گم ہوجاتے ہیں۔ اور وہ شعلہ جوّالہ ایک دائرہ متصلہ نظر آتا ہے۔ جو ایک انسانی تحریک کا نتیجہ ہے جبکہ تحریک ربانی تو قوی تر ہے۔ اسلئے ایک عرض کو ختم کرکے فوراً اس کی جگہ دوسرا پیدا کر دینا بعید از عقل نہیں۔ محسوسات میں شعلۂ جوّالہ اسکی مثال ہوسکتی ہے۔ متکلمین جواہر کے وجود کو متصل مانتے ہیں۔ مگر حضرات صوفیاء کے نزدیک اعراض کی طرح جواہر بھی باقی نہیں رہتے۔ ان کی اصطلاح میں اس کا نام تجدد امثال ہے۔ یعنی جوہر کی ایک شل گئی اور دُوسری وجود میں آگئی اور یہ تبدیلی اس تیزی سے ہوتی ہے کہ جو اجزاء پہلے تھے اب بھی وہی نظر آتے ہیں۔

محققین کے نزدیک سات سال میں پُورے اجزاء بدل جاتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ قرآنی آیت "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ" کہ ہر دن اللہ تعالیٰ ایک خاص حال میں ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر آن میں ایک جزء کو فنا کرکے دُوسرا پیدا کر دیتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ صوفیاء کے نزدیک قرآنی آیت كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۔ کہ جو کچھ اس زمین پر ہے سب فنا ہونے والا ہے۔ اسمیں جواہر اور اعراض سب داخل ہیں۔

جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ سُورۃ فاتحہ کا ہر پڑھنے والا یہ درخواست کرتا ہے کہ ہدایت کا ایک فرد اگرچہ اسکو حاصل ہے مگر چونکہ اعراض کو بقاء نہیں اسلئے ہدایت کا آنیوالا دوسرا فرد اس کا مطلوب ہے اور چونکہ دُوسرے کو بھی بقاء نہیں اس لئے اس سے اگلا فرد مانگ رہا ہے۔ اور جب تک فاتحہ پڑھتا رہتا ہے یُوں ہی

ہدایت کے آنیوالے افراد کی طلب کرتا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ دنیا میں ہدایت پر قائم نہ رہنے کا خطرہ بھی لگا رہتا ہے اسلئے دوام اور استمرار ہدایت کے لئے بار بار درخواست کرتا ہے کہ یا اللہ ہدایت پر قائم و دائم فرما۔ اس سے تحصیل حاصل یا خالی از ہدایت ہونے کا شبہ ختم ہوگیا۔

۸ اَلشُّبْهَةُ الثَّامِنَةُ

آٹھواں اعتراض سورۃ

فاتحہ پر یہاں نحوی حیثیت سے ہے کہ اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ مبدل منہ ہے اور صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اس سے بدل ہے۔ سوال یہ ہے کہ مبدل منہ کی یہاں ضرورت کیا تھی؟ صرف یوں کیوں نہ کہہ دیا گیا کہ اِهْدِنَا صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (بتلا ہم کو راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا)

اَلْجَوَابُ

اس کا جواب یہ ہے کہ مبدل منہ کی ضرورت یہاں یہ ہے کہ اس سے اظہار استقامت مقصود ہے۔ یعنی مُنْعَمِیْن کا صراط (راستہ) موصوف بالاستقامت ہے۔ اور اگر مبدل منہ مذکور نہ ہوتا تو صراط کی وضاحت نہ ہوتی کہ واقعی طور پر منعمین کا راستہ مستقیم ہے یا نہیں۔ انعمت علیہم میں اَنْعَمْتَ ماضی کا صیغہ ہے جس میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ان لوگوں پر زمانہ ماضی میں انعام ہو چکا ہے۔ یہ انعام یافتہ لوگ کون ہیں؟ تو اَلْقُرْآن يُفَسِّرُ بَعْضُهُ بَعْضًا کے مطابق سورۃ نساء کی آیت نمبر ۶۹ میں انعام یافتہ

حضرات کے چار طبقے بیان فرمائے گئے ہیں ؛ ارشاد ہے :

مَن يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ	اور جس نے حکم مانا اللہ اور رسول کا سو یہ
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ	لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ
اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ	نے انعام کیا ، وہ نبی ، صدیق ، شہید اور
النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ	نیک بخت ہیں ۔
وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ	اور اچھی ہے ان کی رفاقت ۔
وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ؕ	(النساء : ۶۹)

نبیین میں حضرۃ آدم علیہ السلام سے لیکر ہمارے آقا حضرۃ محمد صلے اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء شامل ہیں ۔ بقیہ تین طبقے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تھے ۔ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی راہ ایک ہی ہے ۔ ان کی راہیں مختلف نہ تھیں ۔ جو ان سے ہٹا وہ دین سے کٹا ۔ اور مغضوبین وضالین کی راہ پر ہو گیا ۔ (اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْهُ)

⑨ اَلشُّبْهَةُ التَّاسِعَةُ

نواں اعتراض

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ پر کیا جاتا ہے کہ آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ جو انعام یافتہ ہیں وہ نہ تو مغضوب ہیں اور نہ ضالین ۔ اب سوال یہ ہے کہ انعام غضب وضلالت دونوں کی ضد ہے اس لئے صرف غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ہی کافی تھا اور اس میں اختصار بھی تھا ۔ پھر وَلَا الضَّآلِّيْنَ لانے کی کیا ضرورت تھی ؟

الجواب اس کا جواب یہ ہے کہ تکمیل دعا کے لئے یہ دونوں فقرے لائے گئے ہیں۔ صرف ایک پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ ہم ان منعمین کا راستہ چاہتے ہیں جن کا منعم علیہم ہونا یقینی ہو اور غضب و ضلال ان پر کبھی نہ آئے۔

بات یہ ہے کہ عقلاً اس کا احتمال تھا کہ ایک جماعت پہلے تو انعام یافتہ ہی سے ہوتی لیکن پھر بھٹک کر اور مرتد ہو کر راہِ ضلال اختیار کر لیتی۔ تو اس صورت میں ان کا انعام یافتہ ہونا کالعدم ہو جاتا۔ کیونکہ نجات کا مدار خاتمے پر ہے۔ چونکہ سورۃ فاتحہ ایک دعا ہے جسکو ہر طرح مکمل بنایا گیا ہے۔ کہ جن انعام یافتہ حضرات کا راستہ ہم مانگ رہے ہیں وہ مغضوبیت اور ضلالت دونوں مضرتوں سے محفوظ ہوں۔

⑩ اَلشُّبْهَةُ الْعَاشِرَةُ

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالےٰ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرۃ صلے اللہ علیہ وسلم نے مغضوب علیہم سے مراد یہود اور ضالین سے نصاریٰ مراد لئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان انعام یافتہ حضرات کا راستہ چاہتے ہیں جو نہ یہودی ہیں اور نہ نصرانی بلکہ ہم اسلام والے راستے پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔

اب اعتراض یہ ہے کہ قاعدہ یہ ہے کہ کُلُّ مَغْضُوْبٍ ضَالٌّ اور کُلُّ ضَالٍّ مَغْضُوْبٌ (کہ ہر وہ شخص جو مغضوب ہے وہ ضال بھی ہے اور ہر گمراہ مغضوب بھی ہے) اس سے یہود و نصاریٰ ہر ایک کا گمراہ و مغضوب ہونا

معلوم ہوا تو پھر یہاں مغضوب سے صرف یہود اور ضالین سے صرف نصارٰی کیوں مراد لیئے گئے ؟

اَلْجَوَابُ اس کا جواب یہ ہے کہ فساد اعتقاد کا نام ضلالت ہے۔ اور فساد عملی کا نام مغضوبیت ہے اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ صرف فساد اعتقادی پر دُنیا میں گرفت نہیں ہوتی۔ بلکہ معاملہ آخرت کے سپرد ہوتا ہے۔ دُنیا میں گرفت اس فساد اعتقاد پر ہوتی ہے جس میں عقیدے کے فساد کے ساتھ عملی بگاڑ بھی مل جائے۔ چونکہ یہ معاملہ عہدِ نبوّت کا ہے اس وقت فساد عقیدہ یہود و نصارٰی دونوں میں مشترک تھا جبکہ یہود میں فسادِ عقیدہ کے ساتھ فساد عملی بھی تھا۔ نصارٰی فساد عقیدہ کے باوجود مسلمانوں سے مودّت و پیار رکھتے تھے جیسا کہ قرآن کا بیان ہے۔

اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ عہد نبوی میں نصارٰی کے ساتھ جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ بلکہ نجران کے نصارٰی کا وفد جو مدینہ طیبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا انہوں نے جزیہ دینا منظور کیا کہ اسلامی حکومت کی وفادار رعیت بن کر رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیوی عذاب کا تعلق ان سے نہیں ہوا جبکہ یہود کے ساتھ عہدِ نبوی میں جنگ کی نوبت بھی آئی۔ کیونکہ ان میں فساد عقیدہ کے ساتھ فساد عمل بھی تھا۔ اسی لئے قرآن پاک میں ہے :

كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ : ہوجاؤ بندر ذلیل۔

اور دوسری آیت میں یہود کی دنیوی سزاؤں کو بیان کر دیا گیا ہے :

یہود و نصاریٰ کے اس عملی فرق کو خود قرآن پاک میں ذکر فرمایا ہے:

لتجدن اشد الناس	تمام آدمیوں سے زیادہ مسلمانوں
عداوۃ للذین اٰمنوا	سے عداوت رکھنے والا آپ یہود و
الیھود والذین اشرکوا	مشرکین کو پائیں گے ۔ اور مسلمانوں
ولتجدن اقربھم مودۃ	سے قریب تر دوستی رکھنے میں
للذین اٰمنوا الذین قالوا	ان لوگوں کو پائیں گے جو یہ کہتے ہیں
انا نصاریٰ ذٰلک بان	کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس واسطے کہ
منھم قسیسین ورھبانا	نصاریٰ میں عالم ہیں اور درویش ہیں اور
وانھم لا یستکبرون ہ	اس واسطے کہ وہ تکبر نہیں کرتے ۔

(سورۃ المائدہ : ۸۱)

الحاصل یہود فساد عقیدہ اور فساد عمل دونوں کی وجہ سے مغضوب کہلائے اور نصاریٰ نے چونکہ عہد نبوت میں کھل کر مقابلہ نہیں کیا ۔ اسلئے ضالین کہلائے۔ تاہم اسمیں شک نہیں کہ نصاریٰ میں فسادِ عقیدہ کے ساتھ فسادِ عمل بھی رہا۔ لیکن یہود کی شہرت فساد عملی میں زیادہ تھی۔ اسکی مثال یہ ہوسکتی ہے کہ کسی ایک شخص یا جماعت میں بہت سی صفات ہوں لیکن اسکی شہرت کسی ایک صفت سے ہو جائے تو پھر دیگر حیثیات کو نظر انداز کر کے اسی ایک مشہور صفت سے تذکرہ کیا جاتا ہے اسی طرح نصاریٰ ضلالت میں شہرت رکھتے تھے۔ اس لئے روایت بالا کے مطابق زبان نبوت سے ان القابات سے ملقب ہوئے۔

(۱۱) الشبھۃ الحادیۃ عشر

گیارہواں اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مغضوب یہود کو اور ضالین نصارٰی کو قرار دیا ہے۔ جبکہ یہ مغضوبیت اور گمراھی، اسلام سے ہٹ کر تمام کافر اقوام کو شامل ہے۔ یہ صفات یہود و نصارٰی کے علاوہ ہندو مت، بدھ مت اور دوسری غیر مسلم اقوام میں بھی پائی جاتی ہیں، تو پھر یہود و نصارٰی کی تخصیص کی کیا وجہ ہے؟

اَلْجَوَاب

اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں احتمالات عقلیہ چار ہیں:

نمبر۱: عقیدہ اور عمل دونوں درست ہوں۔ یہ انعام یافتہ طبقہ ہوا۔

نمبر۲: عقیدہ اور عمل دونوں فاسد ہوں۔ یہ مغضوبین کی جماعت ہوئی۔

نمبر۳: عقیدہ فاسد ہو عمل نسبتاً درست ہو۔ یہ ضالین کی جماعت ہوئی۔

نصارٰی چونکہ سیاسی لوگ ہیں جنکو ضالین قرار دیا گیا ہے۔ ان کی نسبتاً عملی درستگی کی مثال یہ ہے کہ انسانیت کی خدمت سیاسی مصالح کی بنا پر کرتے ہیں۔

نمبر۴: عمل فاسد ہوا اور عقیدہ درست ہو یہ مؤمن فاسق کا درجہ ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ عقیدہ و عمل کے فساد و درستگی کے لحاظ سے احتمالات عقلیہ چار ہی ہیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ضلالت و مغضوبیت میں کفار کی مختلف اقسام میں یہود و نصارٰی کو جو خاص طور پر متعین فرمایا ہے تو اسکی وجہ تخصیص یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ آپ عموماً تفسیر الکلی بالجزئی فرمایا کرتے تھے۔ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اصل عنوان حال واضح اور منکشف ہو جائے۔ کلی کی چونکہ محسوس صورت نہیں ہوتی جبکہ جزئی محسوس ہوتی ہے۔ اسکی مثال یہ ہے کہ مفسرین حضرات کی عادت ہے کہ قرآن

پاک کی آیت من دون اللہ انداداً (اللہ کے سواء شرکاء) کی تفسیر اصنام سے کرتے ہیں۔ اس سے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بتوں کی پوجا تو منع ہے لیکن بزرگوں کی پوجا جائز ہے۔ حالانکہ مِنْ دُوْنِ اللہ ایک کلی ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کو مستثنیٰ کر کے باقی تمام کائنات اس کا مصداق ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا باقی سب کچھ مِن دُونِ اللہ ہے۔ ورنہ ارتفاع نقیضین لازم آئے گا۔ اسلئے کہ ایسی کوئی چیز نہیں جو اللہ بھی نہ ہو اور من دون اللہ بھی نہ ہو۔ اور چونکہ اس وقت عام رواج اصنام یعنی بتوں کی پوجا پاٹ کا تھا۔ اسلئے مفسرین حضرات نے تفسیر الکلی بالجزئی کی۔ یعنی دون اللہ جو کلی تھی اسکی تفسیر اصنام یعنی جزئی سے کر دی گئی۔ اس کا مقصد کلی کو واضح کرنا تھا۔ ورنہ اصنام میں حصر مقصود نہ تھا۔

اسی طرح فاتحہ کی آیت غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ میں تمام کفار داخل ہیں جس کا ایک عنوان غیر مسلم اقوام ہے۔ یہ ایک مفہوم کلی ہے جسکے افراد و جزئیات ہیں میں یہود و نصاریٰ مجوس بت پرست ہندو وغیرہ سب داخل ہیں لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کلی کی تفسیر و وضاحت کے لئے یہود اور نصاریٰ جزئیات سے کر دی جو اس وقت عرب میں مشہور اور معروف بھی تھے اور قرآن کے مخاطبین اولین ان کو جانتے تھے۔

جوابِ دوم | مغضوبین اور ضالین کی تفسیر میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے نے جو یہود و نصاریٰ کا ذکر فرمایا ہے اسکی حکمت یہ ہے کہ آپ کو امت مسلمہ کے متعلق اس بات کا خطرہ کم تھا کہ وہ مجوسی ہو جائیں گے۔ یا ہندو مت

اور بدھمت یا کوئی اور مذہب اختیار کریں گے۔ لیکن یہودیت نصرانیت کے فتنے میں مبتلا ہونے کا احتمال زیادہ تھا۔ اسلئے خصوصیت کے ساتھ آپ نے یہود و نصاریٰ کا تذکرہ فرمایا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کل اس بیسویں صدی میں بھی اُمتِ مُسلمہ کے لئے سب سے بڑا فتنہ یہودیت اور نصرانیت ہی ہے۔ بلکہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ تو اپنے عمل و افکار میں یہود و نصاریٰ کے پیروکار معلوم ہوتے ہیں۔ اسلئے سورۃ فاتحہ میں جہاں امت کو صراطِ مُستقیم اور انعام یافتہ حضرات کے راستے کو مانگنے کی تلقین ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس امت کا انعام یافتہ جماعت سے نکل کر جن جماعتوں میں چلے جانے کا زیادہ احتمال اور خطرہ تھا۔ اس کا خصوصیت سے ذکر فرمایا اور جس کا خطرہ کم تھا اسے نظر انداز کر دیا گیا۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی نظر میں مستقبل کا سب سے بڑا فتنہ یہودیت اور نصرانیت کا فتنہ تھا اسلئے اس خطرے کا الارم چودہ سو سال قبل دے دیا گیا تھا تاکہ اُمتِ مُسلمہ اس عظیم فتنے سے محفوظ رہے لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ آج امتِ مُسلمہ جامع الأمرین بن گئی ہے۔ اخلاقاً یہودیانہ طرزِ عمل مثلاً نفاق، تشتت، حسد اور مال کی خاطر دین میں تحریف کرنا یہ یہودیانہ انداز ہے جبکہ صورتاً شکلاً، تمدناً، تہذیباً عیسائیوں اور نصاریٰ کا انداز عموماً مُسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔ خُلاصہ یہ کہ رحمتِ عالم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو اپنی اُمت کے بارے میں ان دو فتنوں کا زیادہ خطرہ تھا اسلئے مغضُوب اور ضالین کی تفسیر میں ان کی تخصیص فرمادی۔ تمّت بالخیر

خاتمہ کتاب

اللہ رب العزت کا شکریہ بندۂ عاجز کیسے ادا کر سکتا ہے کہ صرف اسکی توفیق وعنایت سے "دروس سورۃ الفاتحہ" کی شکل میں اپنے استاذ گرامی حضرت علامہ افغانیؒ کے افادات وافاضات کی ترتیب وتبویب سے فراغت پائی ہے۔ استاذ گرامی کے افادات کا یہ صرف ایک حصّہ ہے جبکہ دوسرے موضوعات پر حضرت الاستاذ کے علمی جواہر جمع کرنے باقی ہیں۔

اُن قارئین کرام سے درخواست ہے کہ جو "دروس سورۃ الفاتحہ" سے مستفید و مستفیض ہوئے ہوں وہ بارگاہِ مجیب الدعوات میں دُعا کریں کہ اس خادم کو مزید توفیق عنایت فرمائے تاکہ وہ حضرت الاستاذ کے دیگر علمی مضامین کو منظرِ عام پر لا سکے۔

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حقیقت کی وضاحت وصراحت کردی جائے کہ دروس سورۃ الفاتحہ حضرت الاستاذ کے افادات ہیں جن کو آج سے اٹھائیس سال قبل دوران بیان احقر نے قلم بند کیا تھا۔ اور اب موجودہ شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

مجھے اپنے دامنِ علم وفہم کی تنگدامنی کا پورا احساس ہے اور اعتراف ہے۔ لہٰذا قارئین کو جو بات وزنی اور اچھی معلوم ہو اسکو حضرت الاستاذ کا فیضان سمجھیں اور جو بات علم وتحقیق کی میزان پر پوری نہ اُترے اُسے راقم کی کم فہمی پر محمول کریں مزید یہ کہ اہلِ فکر ونظر کی تعمیری تنقید کو بہ صد شکریہ قبول کیا جائے گا۔

الاحقر علی اصغر العباسی